ہمارا تعلیمی نظام

محمد تقی عثمانی

ہمارا تعلیمی نظام

محمد تقی عثمانی

زمزم بکڈپو دیوبند

نام کتاب — ہمارا تعلیمی نظام

مصنف — حضرت مولانا تقی عثمانی

باہتمام — اسعد واجدی

سن طباعت — مارچ ۱۹۹۵ء

قیمت — Rs. 45/=

ناشر

زمزم بکڈپو دیوبند

فہرست مضامین

دینی مدارس کا نصاب و نظام

فقہی مقالات

مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ

کے قلم سے

فقہی مقالات :۔ دورِ حاضر کے اہم اور پیچیدہ علمی مسائل پر وہ گراں قدر کتاب ہے، جس نے پورے برّ اعظم میں تہلکہ مچا دیا ہے۔

فقہی مقالات :۔ نئے دور کے نئے مسائل پر وہ انمول کتاب ہے، جس میں شریعت کے اصول و ضوابط کی روشنی میں ہر مشکل مسئلہ کا حل دریافت کیا گیا ہے۔

فقہی مقالات :۔ ہی وہ منفرد کتاب ہے جس نے سعودی عرب، عراق، مصر، الجزائر، جنوبی افریقہ، قطر، انڈیا، بنگلہ دیش اور پاکستان کے علمی حلقوں میں زبردست خراج تحسین حاصل کیا ہے۔

فقہی مقالات :۔ وہ انمول خزانہ ہے جس کی نظیر اسلامی لائبریریاں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

فقہی مقالات :۔ جس کی ہر گھر میں ضرورت اور ہر شخص کی اپنی طلب ہے
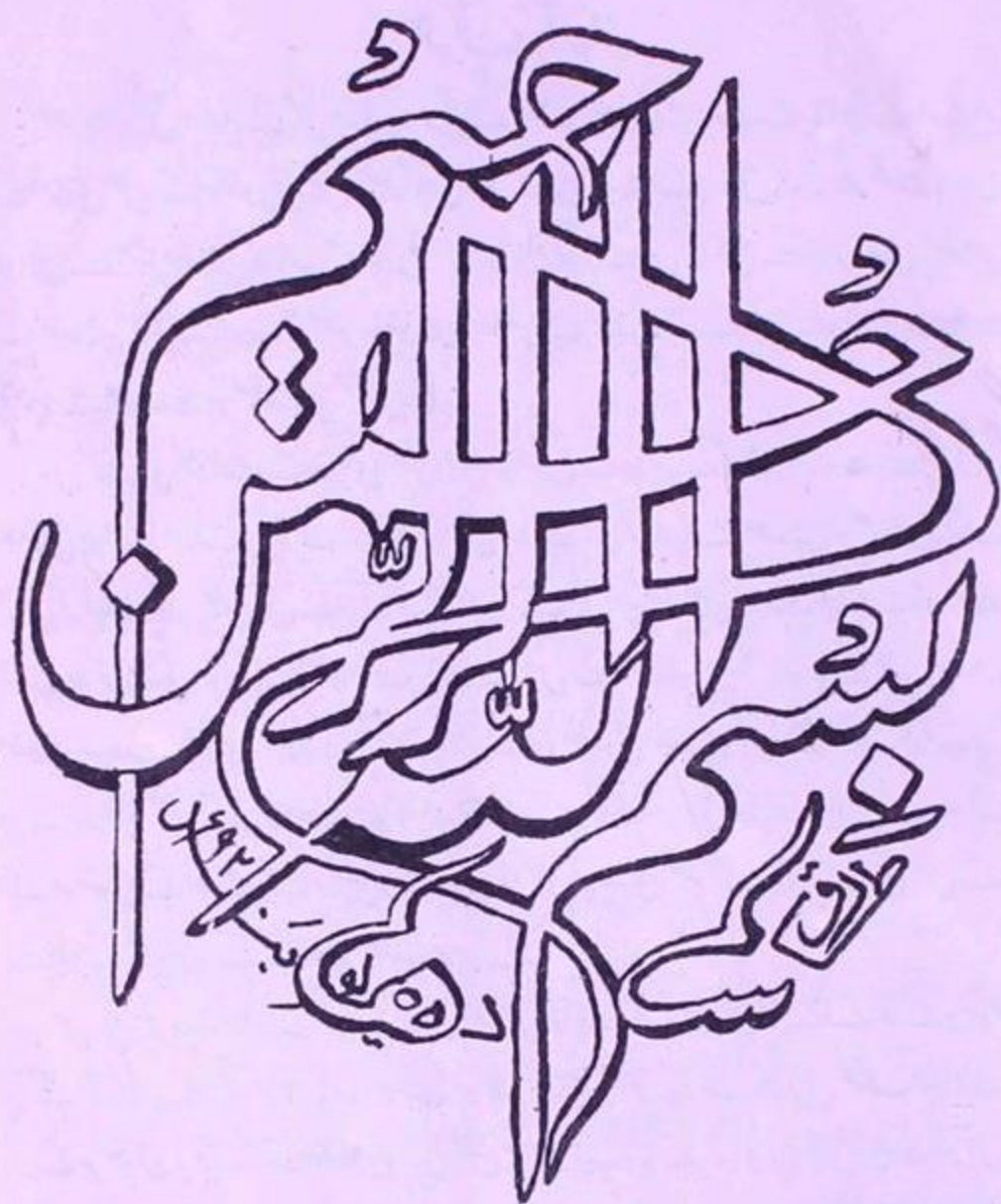
خُدا کے نام سے آغاز کر رہا ہوں میں
جو مہربان ہے بہت اور رحم والا ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

حرف آغاز

عصر حاضر میں اسلام کے عملی نفاذ اور زندگی کے مختلف شعبوں میں نت نئے پیدا ہونے والے مسائل کے اسلامی حل کے موضوع پر میں پچھلے تئیس سال سے اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ لکھتا رہا ہوں، اور ان میں سے بیشتر مضامین ماہنامہ "البلاغ" میں شائع ہو رہے ہیں۔ آج سے پندرہ سال پہلے اس قسم کے مضامین کا ایک مجموعہ "عصر حاضر میں اسلام کیسے نافذ ہو" کے نام سے شائع ہو چکا ہے جو تقریباً ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل تھا۔

اس کتاب کی اشاعت کے بعد بھی احقر کو اسی موضوع کے دوسرے گوشوں پر بہت سے مضامین لکھنے کا اتفاق ہوا، اور احباب کی طرف سے یہ خواہش سامنے آئی کہ ان نئے مضامین کو بھی اس کتاب میں شامل کر لیا جائے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اگر اس کتاب میں ان مضامین کا اضافہ کیا جائے تو وہ بہت ضخیم کتاب ہو جائے گی، اور ایک تو ضخامت کی وجہ سے اس سے استفادہ مشکل ہو جائے گا۔ دوسرے یہ مضامین سیاست، قانون، معیشت، تعلیم، معاشرت اور انفرادی اصلاح وغیرہ کے مختلف ابواب پر منقسم ہیں۔ اور اتنی ضخیم کتاب کا حصہ بننے کا ایک نقصان یہ ہو گا کہ اگر کوئی صاحب ان میں سے صرف کسی ایک موضوع کے مضامین سے دلچسپی رکھتے ہوں تو انہیں یہ پوری ضخیم کتاب لینی پڑے گی جس کے بہت سے ابواب شاید ان کے لئے مفید مطلب نہ ہوں۔

اس بنا پر میں نے مناسب سمجھا کہ اب ان مضامین کو ایک کتاب میں جمع کرنے کے بجائے ہر موضوع پر الگ الگ مجموعے تیار کرنا زیادہ مناسب ہو گا۔ چنانچہ احقر نے مندرجہ ذیل مختلف عنوانات قائم کر کے ہر عنوان پر ایک مجموعہ مضامین کتابی شکل میں ترتیب دیا ہے:۔ (۱) نفاذ شریعت اور اس کے مسائل (۲) اسلام اور سیاست حاضرہ (۳) اسلام اور جدت پسندی (۴) ہمارا تعلیمی نظام (۵) فرد کی اصلاح (۶) سیرت طیبہ (۷) اصلاح معاشرہ (۸) ہمارا معاشی نظام (۹) مسلمان اور قادیانیت۔

ان نو مجموعوں میں سے اس وقت ایک مجموعہ " ہمارا تعلیمی نظام " پیش خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کو مسلمانوں کے لئے مفید بنائیں، اور یہ احقر کے لئے ذخیرہ آخرت ثابت ہو۔ آمین

محمد تقی عثمانی

۳/ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انداز تعلیم وتربیت

اور اس کے انقلابی اثرات

○

۱۲ ربیع الاول ۹۸ھ کو وزارت مذہبی امور کی طرف سے
راولپنڈی میں ایک قومی سیرت کانفرنس منعقد ہوئی اس
کانفرنس میں مدیر البلاغ نے جو مقالہ پڑھا اس مرتبہ وہ
اداریے میں پیش خدمت ہے:۔ ادارہ

محسن انسانیت، سرور دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پوری انسانیت کے لئے ایک عظیم اور مثالی معلم بنکر تشریف لائے تھے۔ ایسے معلم جنکی تعلیم وتربیت نے صرف تئیس سال کی مختصر مدت میں نہ صرف پورے جزیرۂ عرب کی کایا پلٹ کر رکھدی، بلکہ پوری دنیا کیلئے رشد وہدایت کی وہ ابدی قندیلیں بھی روشن کر دیں جو رہتی دنیا تک انسانیت کو عدل وانصاف امن وسکون اور عافیت واطمینان کی راہ دکھاتی رہیں گی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تئیس سال کی مختصر سی مدت میں جو حیرت انگیز انقلاب برپا کیا اسکی برق رفتاری اور اس کے ہمہ گیر اثرات نے ان لوگوں کو بھی انگشت بدنداں کر دیا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مشن کے سخت مخالف رہے ہیں یہ آپ کی تعلیم وتربیت کا حیرت انگیز کرشمہ تھا کہ تئیس سال کی مختصر مدت میں صحرائے عرب کے جو وحشی علم ومعرفت اور تہذیب وتمدن سے بالکل کورے تھے، وہ پوری دنیا میں علم وحکمت اور تہذیب وشائستگی کے چراغ روشن کرتے ہیں، جو لوگ کل تک ایک دوسرے کے خون سے اپنی پیاس بجھا رہے تھے وہ آپس میں بھائی بھائی بن جاتے ہیں، جہاں ہر طرف قتل وغارت گری کی آگ بھڑک رہی تھی وہاں امن وآشتی کے گلاب کھل اٹھتے ہیں، جہاں ظلم

وبربریت کا دور دورہ تھا وہاں عدل وانصاف کی شمعیں روشن ہو جاتی ہیں، جہاں پتھر کے بتوں کو سجدے کئے جا رہے تھے۔ وہاں توحید کا پرچم لہرانے لگتا ہے۔ اور بالاخر عرب کے ہی صحرانشین جو اپنی جہالت کی وجہ سے دنیا بھر میں ذلیل وخوار تھے ایران وروم کے عظیم سلطنتوں کے وارث بن جاتے ہیں اور ساری دنیا ان کے عدل وانصاف۔ انکی رحمدلی اور انکی شرافت نفس کے گن گانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت کا جو سو فیصد نتیجہ دنیا نے دیکھا ہے۔ تاریخ انسانیت کے کسی اور معلم کے یہاں اسکی نظیر نہیں ملتی۔ آج کے اس مختصر نشست میں ہم اس بات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت کی وہ کیا بنیادی خصوصیات تھیں جنھوں نے دنیا بھر میں یہ حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا۔

موضوع تو بڑا طویل اور تفصیل کا محتاج ہے اور واقعہ یہ ہے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انداز تعلیم وتربیت کی تمام خصوصیات کا احاطہ کسی بھی انسان کے لئے ممکن نہیں ہے۔ لیکن میں یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انداز تربیت کی صرف دو خصوصیات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، جو اپنی محدود بصیرت اور مطالعے کی حد تک مجھے سب سے زیادہ بنیادی معلوم ہوتی ہیں۔

ان میں سے پہلی خصوصیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت ورحم۔ دلسوزی وخیر خواہی اور رحمدلی ونرم خوئی ہے چنانچہ قرآن کریم نے آپ کی اس خصوصیت کا ذکر فرما کر اسے آپ کا کامیابی کا بہت بڑا سبب قرار دیا ہے۔

ارشاد ہے:۔

فبما رحمۃ	پس یہ اللہ کی رحمت ہی تھی جسکی بنا پر
من اللہ لنت لہم	آپ لوگوں کیلئے نرم خو ہو گئے۔ اور اگر
ولو کنت فظا غلیظ	آپ درشت مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ
القلب لانفضوا	
من حولک	

آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے۔"

جس شخص نے بھی سیرت طیبہ کا کچھ مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین نے آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے، آپ کو طرح طرح سے اذیت پہونچائی اور آپ پر مصائب

و آلام کے پہاڑ توڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی. لیکن آپ کی پوری سیرت اس بات کی گواہ ہے کہ آپ کے دل میں کبھی ایک لمحے کے لئے انتقام کا جذبہ پیدا نہیں ہوا. آپ ان پر غضب ناک ہونے کے بجائے ان پر ترس کھاتے تھے کہ یہ لوگ کیسی سنگین گمراہی میں مبتلا ہیں. اور ہر وقت آپ کو یہ فکر دامن گیر رہتی تھی کہ وہ کیا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے حق بات ان کے دل میں اتر جائے. اور یہ ہدایت کے راستے پر آجائیں۔

آپ اس قسم کے معلم نہ تھے کہ محض کوئی کتاب پڑھا کر یا درس دے کر فارغ ہو بیٹھتے ہوں اور یہ سمجھتے ہوں کہ میں نے اپنا فریضہ ادا کر دیا اس کے بجائے آپ اپنے زیر تربیت افراد کی زندگی کے ایک ایک شعبے میں دخیل تھے. آپ ان کے ہر دکھ درد میں شریک اور ہر لمحے ان کی فلاح و بہبود کے لئے فکرمند رہتے تھے. آپکے اسی وصف کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:۔

لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیہ ماعنتم حریص علیکم بالمومنین رؤف رحیم۔	بلاشبہ تمہارے پاس تمہیں میں سے ایک ایسا رسول آیا ہے جس پر تمہاری مشقت گراں گزرتی ہے. اور جو تمہاری بھلائی کے بے حد حریص ہے. اور مسلمانوں پر بے حد شفیق اور مہربان ہے۔"

علامہ نور الدین ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد میں مسند احمدؒ اور معجم طبرانی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ ایک نوجوان سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا. اور اس نے آکر عرض کیا کہ "یارسول اللہ! مجھے زنا کی اجازت دے دیجئے ـــــــــ! ذرا تصور تو کیجئے کہ کیا فرمائش کی جارہی ہے؟ ایک ایسے گھناؤنے گناہ کو حلال قرار دینے کی فرمائش جس کی قباحت و شناعت پر دنیا بھر کے مذاہب و ادیان متفق ہیں. اور یہ فرمائش کس سے کی جارہی ہے؟ اس برگزیدہ ہستی سے جسکی عصمت و عفت سے آگے فرشتوں کا بھی سر جھک جاتا ہے. کوئی اور ہوتا تو اس نوجوان کو مار پیٹ کر، یا کم از کم ڈانٹ ڈپٹ کر باہر نکلوا دیتا. لیکن یہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم تھے جن کا کام برائی پر خفگی کا اظہار کر کے پورا نہیں ہو جاتا تھا. بلکہ جو اس برائی کے علاج کو بھی اپنا فریضہ سمجھتے تھے. آپ کے دل میں اس نوجوان کے خلاف بغض و غضب کے بجائے ہمدردی اور رحم کے جذبات پیدا ہوئے. آپ نے اس پر ناراض ہونے کے بجائے اسے پیار کے ساتھ اپنے پاس بلایا۔ اپنے قریب بٹھایا. اس کے کندھے پر مشفقانہ ہاتھ رکھا اور محبت بھرے لہجے میں فرمایا: "اچھا یہ بتاؤ کہ جو عمل تم کسی اجنبی خاتون کے ساتھ کرنا چاہتے ہو. اگر کوئی دوسرا شخص تمہاری ماں کے ساتھ کرنا چاہے تو کیا تم اسکو گوارا کرو گے؟" نوجوان کے ذہن و فکر کے بند دریچے ایک ایک کر کے کھلنے لگے. اس نے کہا "نہیں" یارسول اللہ!" آپ نے فرمایا! "تو پھر

دوسرے لوگ بھی اپنی ماؤں کے لئے یہ بات پسند نہیں کرتے. اچھا یہ بتاؤ کہ اگر کوئی شخص تمھاری بہن کے ساتھ یہ معاملہ کرے تو کیا تم اس کو گوارا کرلوگے؟" نوجوان نے عرض کیا. "نہیں یارسول اللہ!" آپ نے فرمایا کہ "جو بات تمھیں اپنی بہن کے لئے گوارا نہیں، دوسرے لوگ بھی اپنی بہنوں کے ساتھ اسے پسند نہیں کرتے" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل اس نوجوان کو مثالیں دے کر سمجھاتے رہے اور آخر میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر یہ دعا بھی فرمائی کہ "الھم اغفر ذنبہ وطہر قلبہ وحصن فرجہ۔ "یا اللہ! اسکے گناہ کو معاف فرما دیجئے اور اس کے قلب کو پاک کر دیجئے، اور اسکی شرمگاہ کو عفت عطا فرمائیے" یہاں تک کہ جب وہ مجلس سے اٹھا تو اس گھناؤنے عمل سے ہمیشہ کے لئے تائب ہوچکا تھا[1]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس نوجوان پر غیظ وغضب کا اظہار کر کے اپنے مشتعل جذبات کی تسکین کر سکتے تھے. لیکن اس صورت میں آپ کو اس نوجوان کی زندگی تباہ ہوتی نظر آرہی تھی. یہ آپ کی نرم خوئی، حکمت اور تدبر وتحمل ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ نوجوان ہلاکت کے گڑھے سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوگیا. کاش کہ آج کے مصلحین، اساتذہ اور واعظین سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت پر عمل پیرا ہو سکیں تو آج انھیں اپنے نوجوانوں کی بے راہ روی کی شکایت نہ رہے!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انداز تعلیم وتربیت کی دوسری اہم خصوصیت جسے میں اہمیت کے ساتھ اس وقت ذکر کرنا چاہتا ہوں، اور جو احقر کی نظر میں آپ کے انداز تربیت کی سب سے زیادہ موثر خصوصیت ہے، اور وہ یہ کہ آپ نے اپنے پیروں کو جس جس بات کی تعلیم دی، اس کا بذات خود عملی نمونہ بنکر دکھایا۔ آپ کے وعظ ونصائح اور آپ کی تعلیم وتربیت صرف دوسروں کے لئے نہ تھی، بلکہ سب سے پہلے اپنی ذات کے لئے تھی، اللہ تعالی نے بہت سے معاملات میں آپ کو رخصت وسہولت عطا فرمائی۔ لیکن آپ نے اس رخصت وسہولت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اپنے آپ کو دوسرے تمام مسلمانوں کی صف میں رکھنا پسند فرمایا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو نماز کی تلقین فرمائی۔ تو خود اپنا عالم یہ تھا کہ دوسرے اگر پانچ وقت نماز پڑھتے تھے تو آپ آٹھ وقت نماز ادا فرماتے تھے، جس میں چاشت اشراق اور تہجد کی نمازیں شامل ہیں، تہجد عام مسلمانوں کے لئے واجب نہ تھا، لیکن آپ پر واجب تھا اور تہجد بھی ایسی کہ کھڑے کھڑے پاؤں پر ورم آجاتا تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ "یارسول اللہ! کیا

---

[1] مجمع الزوائد ج ۱ص ۱۲۹ طبع بیروت، کتاب العلم باب فی ادب العالم۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کی تمام اگلی پچھلی لغزشیں معاف نہیں فرمادیں، پھر آپ کو اتنی محنت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟" آپ نے فرمایا کہ "بیشک اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ کرم فرمایا ہے۔ لیکن کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسروں کو نماز با جماعت کی تعلیم دی تو خود یہ عمل کر کے دکھایا کہ ساری زندگی نماز با جماعت کی جو پابندی فرمائی وہ تو اپنی جگہ ہے۔ مرض وفات میں بھی آپ نے مسجد کی جماعت کو نہیں چھوڑا۔ بلکہ دو آدمیوں کے کندھے کا سہارا لے کر مسجد میں تشریف لائے۔ اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسروں کو روزہ رکھنے کا حکم دیا تو خود آپؐ کا عمل یہ تھا کہ عام مسلمان اگر رمضان کے فرض روزہ رکھتے تھے تو آپؐ کا کوئی مہینہ روزوں سے خالی نہ تھا عام مسلمانوں کو یہ حکم تھا کہ صبح کو روزہ رکھ کر شام کو افطار کر لیا کریں۔ لیکن خود آپ کئی کئی روز مسلسل اس طرح روزے رکھتے تھے کہ رات کے وقت میں بھی کوئی غذا آپؐ کے منہ میں نہیں جاتی تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو زکوٰۃ دینے اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی تاکید فرمائی۔ تو سب سے پہلے خود اپنی عملی زندگی میں اس کا بے مثال نمونہ پیش کیا۔ عام مسلمانوں کو اپنے مال کا چالیسواں حصہ فریضے کے طور پر دینے کا حکم تھا۔ اور اس سے زیادہ حسب توفیق خرچ کرنے کی تلقین کی جاتی تھی۔ لیکن خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل یہ تھا کہ اپنی فوری ضرورت کو نہایت سادہ طریقے سے پورا کرنے کے بعد اپنی ساری آمدنی ضرورت مند افراد میں تقسیم فرمادیتے تھے۔ آپؐ کو یہ تک گوارا نہ تھا کہ آپؐ کی وقتی ضرورت سے زائد ایک دینار بھی گھر میں باقی رہے ایک مرتبہ عصر کی نماز کے بعد خلاف معمول فوراً گھر میں تشریف لے گئے۔ اور جلد ہی باہر واپس آئے۔ صحابہ کرامؓ نے وجہ پوچھی تو فرمایا۔ "مجھے نماز میں یاد آیا کہ سونے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا گھر میں پڑا رہ گیا ہے۔ مجھے خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ رات آجائے اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں پڑا رہ جائے" حضرت ام سلمہؓ بیان فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ آپ رنجیدہ گھر میں تشریف لائے۔ میں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا۔ ام سلمہؓ! کل جو سات دینار آئے تھے۔ شام ہو گئی اور وہ بستر پر پڑے رہ گئے" حد یہ ہے کہ مرض وفات کی حالت میں جبکہ بیماری کی تکلیف نے سخت بے چین کیا ہوا آپ کو یاد آتا ہے کہ کچھ اشرفیاں گھر میں پڑی ہیں۔ فوراً حکم دیتے ہیں کہ "انھیں خیرات کر دو۔ کیا محمد اپنے رب سے اس طرح ملے گا کہ اسکے پیچھے اس کے گھر میں اشرفیاں پڑی ہوں۔"

عام مسلمانوں کے لئے آپ کی تعلیم یہ تھی کہ جوش میں آکر اپنی ساری پونجی خیرات کر دینا مناسب

نہیں بلکہ اپنی ضرورت کے مطابق مال اپنے پاس رکھ کر باقی کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو. لیکن مسمانوں کو اس تعلیم کا عادی بنانے کے لئے خود آپ نے اپنے عمل کا یہ نمونہ پیش فرمایا کہ گھر میں کوئی نقدی باقی نہ چھوڑی، تاکہ لوگ اس مثالی طرز عمل کو دیکھ کر کم از کم اس حد تک آسکیں جو اسلام کو عام مسلمانوں سے مطلوب ہے۔ چنانچہ انسانیت کے اس معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی عملی تربیت کا نتیجہ تھا کہ جب قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا کہ:۔

لن تنال البر حتی تنفقوا مما تحبون

تم نیکی کا مقام ہرگز اسوقت تک حاصل نہ کر سکو گے جب تک اپنی پسندیدہ چیزوں میں سے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو۔

توصحابہ کرامؓ نے اس آیت پر عمل کرنے کے لئے مسابقت کا جو غیر معمولی مظاہرہ فرمایا وہ تاریخ انسانیت میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس آیت کے نازل ہونے پر تمام صحابہ کرام نے اپنی پسندیدہ ترین اشیاء خیرات کر دیں، اور ایسی ایسی محبوب چیزوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا جنھیں وہ سالہا سال سے حرزجان بنائے ہوئے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروؤں کو زہد و قناعت کی تعلیم دی، تو خود اپنی زندگی میں اس کا عملی نمونہ پیش کر کے دکھایا، غزوۂ احزاب کے موقع پر جب بعض صحابہؓ نے آپ سے بھوک کی شدت کی شکایت کی اور پیٹ کھول کر دکھایا کہ اس پر پتھر بندھا ہوا ہے تو سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں اپنا بطن مبارک کھول کر دکھایا جس پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو مساوات اور بھائی چارے کی تعلیم دی تو سب سے پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھایا کہ اگر دوسرے مسلمان عام سپاہی کی حیثیت میں مدینہ طیبہ کی دفاع میں خندق کھودنے کی مشقت برداشت کر رہے تھے تو ان کا امیر (صلی اللہ علیہ وسلم) صرف قیادت ونگرانی کا فریضہ انجام نہیں دے رہا تھا، بلکہ بہ نفس نفیس کدال ہاتھ میں لیکر خندق کھودنے میں شریک تھا اور زمین کا جتنا ٹکڑا ایک عام سپاہی کو کھودنے کے لئے دیا گیا تھا، اتنا ہی ٹکڑا اس نے اپنے ذمے لیا تھا۔

ایثار کی تعلیم ہر معلم اخلاق نے دی ہے، لیکن عموماً یہ تعلیم معلم کے الفاظ اور فلسفے سے آگے نہیں بڑھتی، اس کے بر خلاف انسانیت کے اس معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان سے ایثار کے الفاظ کم استعمال کئے اور عمل سے اسکی تعلیم زیادہ دی۔ حضرت فاطمۃ الزہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ کی چہیتی صاحب زادی ہیں، اور مرتبے کے لحاظ سے صرف عرب کی نہیں، دونوں جہان کی قابل احترام شہزادی ہیں، لیکن چکی پیستے پیستے ان کی ہتھیلیاں گھس گئی ہیں، وہ آکر درخواست کرتی ہیں کہ مجھے کوئی خادمہ دلوادی جائے، لیکن مشفق باپ کی زبان سے جواب یہ ملتا ہے کہ "فاطمہ ابھی صفہ کی غریبوں کا انتظام نہیں ہوا، اس لئے تمہاری خواہش پر عمل ممکن نہیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو صبر و تحمل اور عفو و درگذر کا درس دیا تو خود اس پر عمل پیرا ہو کر دکھلایا، ایک مرتبہ کسی شخص کا کچھ قرضہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر واجب تھا، اس شخص نے آپ سے قرض کا مطالبہ کیا، اور اس غرض کے لئے کچھ گستاخانہ الفاظ استعمال کئے ساری دنیا جانتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حقوق العباد کی ادائیگی کا کس قدر اہتمام تھا، اور آپ اس شخص کے تقاضے کے بغیر ہی اس کا قرض ضرور چکاتے، اس لئے اس شخص کے پاس اس تلخ کلامی کا کوئی جواز نہ تھا، چنانچہ جب آپ کے جانثار صحابہؓ نے اس شخص کا یہ گستاخانہ انداز دیکھا تو اسے گستاخی کا مزہ چکھانا چاہا، لیکن رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اس کے تمام تر اشتعال انگیز اور تکلیف دہ رویئے کو دیکھنے کے باوجود صحابہؓ سے فرماتے ہیں کہ:۔

دعوہ فان لصاحب الحق مقالا

"اسے رہنے دو، وہ صاحب حق ہے، اور صاحب حق کو بات کہنے کی گنجائش ہوتی ہے" اور عفو درگذر کا جو معاملہ آپ نے فتح مکہ کے موقع پر فرمایا، وہ تو ساری دنیا کو معلوم ہے کہ جن لوگوں نے آپ اور آپ کے ساتھیوں پر عرصہ حیات تنگ کرنے کے لئے ظلم و ستم کا کوئی طریقہ نہیں چھوڑا تھا" انہی لوگوں پر فتح پانے کے بعد آپؐ نے یہ اعلان فرمادیا کہ:۔

لاتثریب علیکم الیوم، اذھبوا فانتم الطلقاء

آج کے دن تم پر کچھ ملامت نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو

خلاصہ یہ ہے کہ آپ کی وہ تعلیم و تربیت جس نے دشمنوں تک کے دل جیتے، اور جس نے ایک وحشی قوم کو تہذیب و شائستگی کے بام عروج تک پہونچایا، اسکی سب سے بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ وہ تعلیم محض ایک فکر اور فلسفہ نہیں تھی جسے خوبصورت الفاظ کا خول چڑھا کر آپ نے اپنے پیروؤں کے سامنے پیش کر دیا، بلکہ وہ ایک متواتر اور پیہم عمل سے عبارت تھی، آپ کی مبارک زندگی کی ہر ہر ادا مجسم

تعلیم تھی، چنانچہ اگر احادیث نبویؐ کا استقراء کر کے دیکھا جائے تو اس میں قولی احادیث کی تعداد کم ہے اور عملی احادیث کی تعداد زیادہ ہے۔ علامہ علی متقی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "کنز العمال" اب تک احادیث نبویؐ کا سب سے جامع ذخیرہ سمجھی جاتی ہے۔ اس کتاب میں علامہ موصوفؒ نے ہر عنوان کے تحت قولی احادیث اور فعلی احادیث کو الگ الگ ذکر کیا ہے۔ اگر اس کتاب ہی کا جائزہ لے لیا جائے تو بیشتر عنوانات کے تحت قولی احادیث کا حصہ مختصر اور فعلی احادیث کا حصہ زیادہ نظر آتا ہے۔ جس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کی تعلیمات نے روئے زمین پر جو حسین دلکش انقلاب برپا فرمایا۔ اس میں زبانی تعلیم کا حصہ کم اور عملی تعلیم کا حصہ زیادہ ہے۔

آج اگر ہم میں اساتذہ کی تعلیم، واعظوں کے وعظ اور خطیبوں کی تقریریں نتائج کے اعتبار سے بے جان اور اصلاح معاشرہ کے عظیم کام کے لئے بے اثر نظر آتی ہیں تو اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ آج ہمارے معلموں، واعظوں اور خطیبوں کے پاس صرف دلکش الفاظ اور خوش نما فلسفے تو ضرور ہیں لیکن ہماری عملی زندگی ان دلکش الفاظ اور خوش نما فلسفوں سے یکسر متضاد ہے۔ اور ایسی تعلیم و تربیت نہ صرف یہ کہ کوئی مفید اثر نہیں چھوڑتی، بلکہ بسا اوقات اس کا الٹا اثر یہ ہوتا ہے کہ مخاطب ایک شدید ذہنی کشمکش اور فکری انتشار کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ استاذ کا بیان کیا ہوا زبانی فلسفہ اور مقرر کی شعلہ بیان تقریریں ایک محدود وقت کے لئے انسانوں کو اپنی طرف متوجہ ضرور کر لیتی ہیں، اور بہت زیادہ ہو تو عقل ان کی صحت کو تسلیم کر لیتی ہے۔ لیکن دلوں کو متاثر کرنے اور زندگیوں کی کایا پلٹنے کا عظیم کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک معلم کی تعلیم اور واعظ کا وعظ خود اس کی اپنی زندگی میں عملی طور پر رچا بسا ہوا نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اور ہمارے معلموں اور واعظوں کو اس بات کی توفیق عطا فرمائے کہ وہ اس راز کو سمجھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی صحیح معنی میں پیروی کر سکیں۔ آمین۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

(ماہنامہ "البلاغ" جمادی الثانی ۱۳۹۸ھ ج ۱۲ ص ۳۲۳)

تعلیمی پالیسی (۱)

حکومت کی نئی تعلیمی پالیسی پر غور کرنے کے لئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب نے علماء کی ایک کمیٹی بنائی تھی، اس کمیٹی نے جو تجاویز حکومت کو روانہ کیں، ان کی ترتیب وتسوید میں راقم الحروف بھی شامل تھا۔ ذیل میں یہ تحریر پیش خدمت ہے۔

(م۔ت۔ع)

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

حال ہی میں ایئر مارشل نور خان صاحب ڈپٹی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر پاکستان کی طرف سے جو نئی تعلیمی پالیسی شائع ہوئی ہے وہ بنیادی طور پر بڑی امید افزا اور قابل قدر ہے، پاکستان کی بیس (۲۰) سالہ تاریخ میں شاید یہ پہلا موقع ہے کہ تعلیم جیسے اہم اور بنیادی مسئلے پر ایک آزاد مسلمان قوم کی حیثیت سے غور وفکر کیا گیا ہے اور موجودہ نظام تعلیم کا حقیقت پسندی کے ساتھ جائزہ لے کر اس کو پاکستان کے مخصوص قومی حالات، ملی مزاج اور اس کی نظریاتی بنیادوں کے مطابق بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اور سب سے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ کسی مخصوص طبقے یا جماعت کے خیالات کو قوم پر مسلط کرنے کا وہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا جو اس سے پہلے اکثر ہوتا رہا ہے بلکہ کھلے دل کے ساتھ قوم کے ماہرین تعلیم سے اس اسکیم پر تبصرہ اور تجاویز طلب کرنے کے لئے ایک وسیع وقت دیا گیا ہے۔

ہم اس طریق کار کا گرم جوشی سے خیر مقدم کرتے ہیں اور اجتماعی طور سے غور وفکر کرنے کے بعد اس پالیسی سے متعلق اپنی رائے اور وہ امور ذیل میں پیش کرتے ہیں جو ہمارے نزدیک اس پالیسی کے مبارک مقاصد حاصل کرنے کے لئے

بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۔ تعلیم کا مقصد

سب سے پہلی اور بنیادی چیز جس کی طرف سب سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہماری قوم کے سامنے تعلیم کا ایک اعلیٰ مقصد اور بلند نصب العین ہونا چاہئے لارڈ میکالے کے لائے ہوئے نظام تعلیم کا مقصد ہی چوں کہ سرکاری ملازم پیدا کرنا تھا اس لئے اس نظام کے اثر سے یہ بات ہمارے طلباء کے رگ وپے میں سرایت کر چکی ہے کہ پڑھنے لکھنے کا مقصد اچھی ملازمتوں کے حصول سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ اس کے ذریعہ کوئی اچھا ذریعہ معاش پیدا کیا جائے، لہٰذا تعلیم کے سلسلے میں ان کی ساری کاوشیں اسی مقصد کے گرد گھومتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں خواہ تعلیم کتنی ہی پھیل جائے، نہ اس سے ملک کو اجتماعی سطح پر کوئی خاطر خواہ فائدہ پہنچ سکتا ہے اور نہ کوئی ایسی قوم وجود میں آسکتی ہے جو اپنی روٹی اور پیٹ سے آگے کچھ سوچ سکتی ہو۔

لہٰذا تعلیم کے سلسلے میں سب سے پہلے طرز فکر کے اندر یہ بنیادی تبدیلی لانے کی ضرورت ہے کہ تعلیم کا مقصد صرف حصول معاش نہیں، بلکہ ذات کی تکمیل، اعلیٰ انسانی اوصاف کا حصول اور پوشیدہ صلاحیتوں کا نکھار ہے اور ان چیزوں کے ذریعہ فرد کو ملک وملت بلکہ پوری انسانیت کی حقیقی خدمت کے لئے تیار ہونا ہے۔

نئے نظام تعلیم کے ذریعہ یہ بات ہمارے ہر پڑھے لکھے شخص کے دماغ اور قلب وروح میں سماجانی چاہئے کہ ایک تعلیم یافتہ انسان کا مقصد زندگی اپنے لئے بہتر وسائل معاش حاصل کر کے ہرگز پورا نہیں ہوتا بلکہ اس کا اصل مقصد اپنے علم، اپنے فن، اپنی ذہانت اور اپنی صلاحیت کے ذریعہ خود اپنے نظریات، اخلاق وکردار کو بہتر بنانا اور ملک وملت کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانا ہے۔ معاش کا حصول تعلیم کا ثانوی مقصد تو ہو سکتا ہے لیکن اس کا اولین مقصد، محرک اور نصب العین نہیں۔

زیر تبصرہ تعلیمی پالیسی میں اگرچہ بنیادی طور پر اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ موجودہ تعلیمی نظام قوم کو صحیح مقصد دینے سے قاصر رہا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو پوری طرح نمایاں نہیں کیا گیا بلکہ جگہ جگہ تعلیم کے ساتھ اقتصادی خوشحالی کا تذکرہ غلط تاثر پیدا کر سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی تعلیمی پالیسی میں مقصد کی درستی کو بنیادی اہمیت دی جائے اور عملی طور پر صحیح مقصد کو قوم کی رگ وپے میں سرایت کرانے کے لئے ہر ممکن طریقہ اختیار کیا جائے۔

اسلامی نظام تعلیم کا مطلب

زیر تبصرہ تعلیمی پالیسی میں کئی مقامات پر اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ پاکستان اسلام کی بنیاد پر وجو میں آیا تھا۔ لہٰذا یہاں کا نظام بھی اسلام پر مبنی ہونا چاہیے۔ ہم یہاں قدرے وضاحت کے ساتھ اس بات کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں کہ اسلامی نظام تعلیم کا کیا مطلب ہے اور اسے نافذ کرنے کی صحیح صورت کیا ہے؟

نصاب کی تدوین نو

انگریزی اقتدار کے عہد میں ہم پر جو نظام تعلیم مسلط کیا گیا تھا اس میں دوسری خرابیوں کے علاوہ ایک بنیادی خرابی یہ تھی کہ اس میں اسلام کو زندگی کے تمام شعبوں سے کاٹ کر عبادتوں اور نجی زندگی کے چند معاملات تک محدود کر دیا تھا۔ یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ اسلام زندگی کا ایک مکمل نظام ہے اور وہ حکومت و سیاست سے لے کر تجارت و معیشت تک زندگی کے ہر شعبے کے لئے اپنی مخصوص تعلیمات اور ہدایات رکھتا ہے۔ لہٰذا جس وقت دنیا میں یہ دین عملاً نافذ تھا اس وقت نظام تعلیم کا حال بھی یہ تھا کہ اسلام کی تعلیم صرف اسلامیات کے مضمون کی حد تک محدود نہ تھی بلکہ ہر علم و فن کی تعلیم میں اسلام رچا بسا نظر آتا تھا۔ طالب علم فلسفہ پڑھ رہا ہو یا منطق، سائنس کی تعلیم حاصل کر رہا ہو یا حساب اور ریاضی کی، طب کی تعلیم میں مشغول ہو یا صنعت و حرفت کی تعلیم میں، غرض ہر علم و فن کے رگ و ریشہ میں اسے اسلامی نظریات اور مفکرین اسلام کے افکار یا کم از کم اسلامی طرز فکر سمایا ہوا ملتا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ علم و فن کے خواہ کسی گوشے کو اپنی زندگی کا محور بنالے وہ ذہنی اور عملی طور پر سچا اور پکا مسلمان ہوتا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں اسلام کے مقابلے میں دوسرے افکار سے مرعوبیت پیدا ہو ہی نہیں سکتی تھی، یہ نظام تعلیم اس میں اتنی صلاحیت پیدا کر دیتا تھا کہ وہ ہر نئی تحقیق اور نئے فلسفے سے اس کے صالح اجزاء کو اپنا لے اور غیر صالح کو چھوڑ دے۔

لیکن موجودہ نظام تعلیم میں اسلام کی اس ہمہ گیر حیثیت کو سرے سے ختم کر دیا گیا ہے اسلام کو صرف "اسلامیات" کے ایک گھنٹے تک محدود کر دیا گیا ہے اور اس ایک گھنٹے میں بھی نصاب اور طرز تعلیم کے معیار کو اس قدر پست کر دیا گیا ہے کو اس سے اسلام کی صحیح تعلیم کا ہزارواں حصہ بھی طالب علم کے سامنے نہیں آسکتا۔

یہ بات چند مثالوں سے واضح ہو سکے گی:

آج کل ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو فلسفہ پڑھایا جاتا ہے اس میں یونانی یا نوافلاطونی فلسفے کے بعد طالب علم سیدھا یورپ کے نشاط ثانیہ کے بعد کے فلسفے پر پہنچ جاتا ہے اور اس کے ذہن پر یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ نوافلاطونی فلاسفہ سے لے کر ڈیکارٹ تک کا پورا زمانہ فکر اور فلسفے میں جمود کا زمانہ ہے۔ علم وفن کی تاریخ میں بھی اس زمانہ کو تاریک زمانہ سے تعبیر کیا جاتا ہے حالانکہ یہ دور صرف غیر مسلم یورپ کے لئے تاریک تھا۔ ورنہ یہی وہ دور ہے جس میں مسلمانوں نے آدھی سے زائد دنیا میں علم وفن کے چراغ روشن کئے ہوئے تھے اور خود یورپ کا خطہ اندلس ان کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ اس دور کے مسلمان فلاسفہ اور متکلمین نے فکر اور فلسفے کے میدان میں جو نئی راہیں کھولی ہیں اور اپنی تحقیقات کا جو بیش بہا ذخیرہ چھوڑا ہے موجودہ نظام تعلیم میں سرے سے ان کا کوئی ذکر ہی نہیں ملتا۔

جدید اسلامی نظام تعلیم میں یہ ضروری ہے کہ اس وسیع علمی خلاء کو پر کیا جائے جو مغرب کی تنگ نظری اور تعصب نے مصنوعی طور پر پیدا کیا ہے اور فلسفے کی تعلیم میں مسلمان فلاسفہ اور متکلمین کے افکار کو ان کا صحیح مقام عطا کیا جائے۔

(۲) سائنس کے بارے میں یہ حقیقت آج پوری دنیا میں مان لی گئی ہے کہ سائنس کی موجودہ ترقی اس استقرائی طریقے کی مرہون منت ہے جس میں صرف قیاس وتخمین کے بجائے مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعہ تحقیقات کی جاتی ہیں لیکن ساتھ ہی مغربی نظام تعلیم نے ہر کس وناکس کے ذہن پر یہ قائم کرا دیا ہے کہ استقرائی طریقہ استدلال کی بنیاد مسلمانوں نے ڈالی تھی، انہوں نے ہی سائنس کا رخ موڑ کر اسے اس راستہ پر ڈالا تھا جس پر آج وہ برق رفتاری سے دوڑ رہی ہے۔ اس کے باوجود ہمارا سائنس کا طالب علم خالد بن یزید، زکریا رازی، ابن سینا، خوارزمی، ابوریحان، بیرونی، فارابی، ابن مسکویہ، ابن رشد، کندی، ابو محمد خوجندی، جابر بن حیان اور موسیٰ بن شاکر جیسے عظیم سائنس دانوں سے یکسر ناواقف رہتا ہے۔

(۳) معاشیات کی تعلیم میں طالب علم آج صرف یہی جانتا ہے کہ بنیادی طور پر معاشیات کے دو مکتب فکر ہیں۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت۔ اسلام کے معاشی اصول اور قوانین اس کی نگاہوں سے بالکل اوجھل رہتے ہیں اور اس کو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اسلام نے بھی معیشت کے بارے میں ایسا نظام بنایا ہے، جو مذکورہ دونوں مکاتب فکر سے الگ ہے اسی طرح اس کو یہ پڑھایا جاتا ہے کہ علم معاشیات کی بنیاد آدم اسمتھ نے رکھی تھی اور اس سے بہت

پہلے کے تمام فقہا سے لیکر ابن خلدونؒ اور شاہ ولی اللہؒ جیسے مفکرین نے علم معاش کی جو خدمات انجام دی ہیں ان کو فہرست سے یکسر خارج کر دیا گیا ہے۔

○ علم سیاست میں بھی نوافلاطونی فلاسفہ اور جدید مغربی فلاسفہ کے درمیان ایک وسیع خلاء ہے جو صرف مغرب کے تعصب اور تنگ نظری کی پیداوار ہے۔ سیاست کے بارے میں اسلام کے اصول و تعلیمات اور مسلمان مفکرین کی کاوشوں کا کوئی ادنیٰ سا عکس بھی موجودہ نصاب میں نہیں ملتا۔

○ (۵) یہی حال عمرانیات کا بھی ہے شاید ہی کوئی منصف مزاج اس بات سے انکار کر سکے کہ اس علم کے مدون اول ابن خلدونؒ ہیں لیکن عمرانیات کے موجودہ نصاب سے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اسلام یا مسلمانوں نے بھی اس علم پر کوئی کام کیا ہے۔

○ (۶) نفسیات کی تعلیم اب بڑے پیمانے پر ہونے لگی ہے لیکن اس سلسلہ میں مسلمانوں کے علماء تصوف نے جو نئی راہیں اور نفس انسانی کے عوارض پر جو مفید ترین بحثیں کی ہیں موجودہ نظام تعلیم میں اس کی کوئی پرچھائیں بھی موجود نہیں ہے۔

○ (۷) قانون اور اصول قانون کے بارے میں بھی ہمارا نصاب تعلیم سراسر مغربی افکار و نظریات ہی سے بھرا ہوا ہے۔ اصول قانون کی دقیق بحثوں کو جس بے نظیر انداز میں فقہائے اسلام نے اصول فقہ میں مدون کیا ہے اس سے استفادہ کا کوئی موقع طالب علم کو نہیں ملتا۔

○ (۸) اسی طرح بعض علوم میں خالص اسلامی احکام کے اجزاء کی ضرورت ہے مثلاً حساب میں سود اور سود در سود کے مسائل تو باقاعدہ پڑھائے جاتے ہیں لیکن میراث اور زکوٰۃ نکالنے کے طریقوں سے طالب علم ناواقف رہتا ہے۔ اسی طرح جغرافیہ کی تعلیم میں سمت قبلہ، اوقات نماز اور مواقیت احرام معلوم کرنے کے طریقے اس کی نظر سے نہیں گزرتے۔ نصاب کی نئی تدوین میں اس قسم کی چیزیں شامل ہونی چاہئیں۔ غرض وہ علوم جنہیں آج جدید علوم یا مغربی علوم کا نام دے دیا گیا ہے ہمارے نظام تعلیم میں ٹھیک اسی ترتیب اور اسی ڈھانچے کے ساتھ لئے گئے ہیں۔ جو مغرب نے اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ تعصب برتتے ہوئے اسلام کا نام لئے بغیر بنایا تھا۔ اب اگر اپنے نظام تعلیم کو اسلامی بنانا اور اس کے ذریعہ صحیح اسلامی قومی شعور پیدا کرنا مقصود ہے تو یہ بات خواہ کتنی محنت طلب کیوں نہ ہو لیکن ناگزیر اہمیت رکھتی ہے کہ ان علوم کے سلیبس کو اپنے قومی تقاضوں کے تحت اس طرح مرتب و مدون کیا جائے کہ اس میں اسلام اور مسلمانوں کے افکار اور کارنامے پوری طرح

رچے بسے ہوں [1]۔

زیر تبصرہ تعلیمی پالیسی کے حصہ اول باب اول کے پیراگراف نمبر ۵ پر غالباً اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس بات کو مزید وضاحت اور وسعت کے ساتھ پالیسی کا جزو ہونا چاہئے۔

۲۔ اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر

نظام تعلیم کو اسلامی بنانے کے سلسلے میں دوسرا اہم کام یہ ہے کہ تعلیم کی نصابی کتابوں کو اس طرح مرتب کیا جائے کہ ان کو پڑھ کر طالب علم میں بحیثیت مجموعی ایک مسلمان ذہنیت اور اسلامی طرز تیار ہو۔ اس کی تشریح وتفصیل یہ ہے کہ کائنات کے تمام چھوٹے بڑے حقائق خواہ وہ اپنی ذات میں کتنے ہی غیر مختلف فیہ کیوں نہ ہوں، اپنے ادراک کرنے والے ذہن کے اعتبار سے مختلف نتائج وثمرات پیدا کرتے ہیں۔ ایک ذہن کا آدمی کسی حقیقت کا ادراک کر کے ایک نتیجے پر پہنچتا ہے، اور دوسرے ذہن کا انسان اسی حقیقت کو سمجھ کر کوئی دوسرا نتیجہ نکال لیتا ہے مثلاً سورج کا وجود اور انسانیت کے لئے اس کا نفع بخش ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن ایک ستارہ پرست شخص نے اس حقیقت سے یہ نتیجہ نکالا کہ اتنی فائدہ مند چیز کہ جس پر زندگی کا دارومدار ہے یقیناً عبادت کے لائق ہے لہٰذا اس کی پرستش شروع کر دی، دوسرا شخص جو مادہ پرست تھا اسی حقیقت سے اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ درحقیقت یہ ارتقائے کائنات کے سلسلے کی ایک کڑی ہے جو خود بخود وجود میں آگئی ہے۔ تیسرے شخص نے جو توحید کا قائل تھا یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ اتنا عظیم الشان جسم جو پوری دنیا کو اپنی روشنی اور حرارت سے ایک لگے بندھے نظام کے ساتھ فائدہ پہنچاتا ہے، یقیناً خود بخود وجود میں نہیں آگیا بلکہ کسی نے اس کو پیدا کیا ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے۔

یہی حال تمام علوم وفنون کا ہے کہ ان میں جو حقائق بیان ہوتے ہیں وہ اپنے تدوین کرنے والوں کی ذہنیت کے مطابق انسان کو مختلف نتائج تک پہنچاتے ہیں۔ اور ان علوم کو پڑھنے والے کا ذہن لازماً ان تدوین کرنے والوں کی ذہنیت اور طرز فکر کو بحیثیت مجموعی اخذ کرتا ہے۔ مغرب کے مادہ پرست نظام فکر نے انہیں خالص مادی فکر کے ساتھ مرتب کیا ہے، جو ان علوم میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ اور شعوری یا غیر شعوری طور پر ان سے مادہ پرستانہ نتائج ہی نکال کر سامنے لاتی ہے۔ ہماری

---

[1] نمونہ کے طور پر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی کتاب "قانون بین الممالک" ملاحظہ ہو جس میں بین الاقوامی قانون کو اسی طرح مدون کیا گیا ہے

زبردست غلطی یہ رہی ہے کہ ہم نے ان علوم کے صرف متن کو نہیں اپنایا بلکہ ان حواشی اور تشریحات کو بھی جوں کا توں اپنے نظام تعلیم میں رکھ لیا جو مادہ پرست ذہنیت نے ان علوم میں گھلا ملا دیئے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان طالب علم درسگاہ میں پہنچ کر جس فکر سے آشنا ہوتا ہے اور اپنے گردو پیش کی دنیا میں جس کا چلن دیکھتا ہے وہ اس کے عقائد کے نظام سے بالکل متضاد ہوتی ہے۔ اور اس کے علم اور عقیدے کے درمیان ایک سخت کشمکش برپا کر دیتی ہے۔

علم اور عقیدے کی اس کشمکش کا نتیجہ یا تو یہ نکلتا ہے کہ وہ زندگی کے سنجیدہ مسائل پر سوچنا ہی چھوڑ دیتا ہے اور اپنی ساری توجہات کا مرکز روٹی اور پیٹ کا بنا کر علم اور عقیدہ دونوں سے عملاً کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ (اور موجودہ دور میں اکثریت ایسے ہی طلباء کی ہے) یا پھر وہ اپنے علم کو عقیدے پر فوقیت دے کر عقائد کو محض ایک ڈھکوسلا سمجھنا شروع کر دیتا ہے اور دین و مذہب کے بارے میں تشکیک کا شکار ہو جاتا ہے یا وہ یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ دین کے عقائد و احکام خواہ کتنے ہی برحق ہوں مگر موجودہ دور میں قابل عمل نہیں۔

اس ساری خرابی کی جڑ یہی ہے کہ ہم اب تک ان علوم کو اسی ذہنیت کے ساتھ پڑھتے پڑھاتے آئے جس ذہنیت کے ساتھ وہ مغرب میں پڑھے اور پڑھائے جاتے ہیں۔

ہمارا نظام اس وقت تک "اسلامی" نہیں کہلا سکتا جب تک کہ ان علوم کو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر کے ساتھ از سر نو مرتب نہ کیا جائے. مزید وضاحت کے لئے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

سائنس اللہ تک پہنچنے، اس کی قدرت کاملہ پر غور و فکر کرنے اور انسان میں اللہ کے آگے عجز کا احساس پیدا کر کے اس کے حضور سجدہ ریز ہونے کا بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن ہمارے زمانے میں سائنس کا طالب علم سائنس اور دینی عقائد کو متضاد سمجھتا ہے اور بسا اوقات سائنس پڑھ لینے کے بعد وہ خدا، رسول، وحی اور آخرت کا یا تو منکر ہو بیٹھتا ہے یا کم از کم سائنس کی گفتگو کے دوران ان عقائد کا تذکرہ کرتے، ہوئے شرماتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ سائنس میں بذات خود کوئی چیز ایسی ہے جو دین سے بیزاری کا احساس پیدا کرتی ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب نے کائنات کے عجیب و غریب حقائق کو جس ذہنیت کے ساتھ بیان کیا ہے وہ مادے کے پار کچھ دیکھنے یا سوچنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، لہٰذا سائنسی حقائق کے بین السطور وہ یہ بات طالب علم کے ذہن نشین کراتی چلتی ہے کہ یہ سب کچھ کائنات کے میکانیکی ارتقاء کا ایک جز ہے ورنہ جو چیز اس کائنات میں آنکھوں سے نظر نہ آسکے اس کے بارے میں کچھ سوچنا بھی پرلے درجے کی دقیانوسیت ہے۔

دوسری طرف قرآن کریم بھی اس کائنات پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے لیکن جو شخص قرآن کریم میں کائنات کے حقائق کو پڑھتا ہے وہ اس نتیجے پر پہنچ کر رہتا ہے کہ کائنات کا یہ مربوط و مستحکم نظام از خود

وجود میں نہیں آسکتا. یقیناً اس کا کوئی پیدا کرنے والا ہے۔ جو اس سارے نظام کی علت اولی ہے۔ وہی اس نظام کو درہم برہم بھی کر سکتا ہے۔ اور پھر اسے کوئی دوسری شکل بھی دے سکتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی نظام تعلیم میں سائنس کی تعلیم اس ذہنیت کے ساتھ دی جائے. مثال کے طور پر بات کہنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ "آگ میں جلانے کی خاصیت پائی جاتی ہے"۔ اور انسان کا دماغ سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن اس بات کو اگر اس طرح کہا جائے کہ اللہ نے آگ میں جلانے کی خاصیت رکھ دی ہے۔ اور "اللہ نے انسان کو سوچنے کے لئے دماغ دیا ہے"۔ تو یہی جملے بار بار سامنے آکر خالص اسلامی ذہنیت کی تعمیر کریں گے۔ خلاصہ یہ کہ ہمارے پورے نصاب تعلیم میں اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر اس طرح رچ جانا چاہئے کہ ہماری درس گاہوں سے جو تعلیم یافتہ افراد پیدا ہوں۔ وہ عام مغربی تعلیم یافتہ افراد کی طرح نہ ہوں بلکہ وہ مسلمان ڈاکٹر. مسلمان سائنس داں. مسلمان انجینئر. مسلمان فلسفی اور مسلمان فنکار ہوں۔ یہ ذہنیت نصاب تعلیم میں کس طرح سموئی جائے؟ اس کا صحیح جواب تو قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی لکھی ہوئی سائنس. فلسفہ. طب. صنعت و حرفت. معاشیات اور سیاست کی کتابیں دیکھ کر بھی ہو سکتا ہے اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ نصاب تعلیم کی تدوین و ترتیب ایسے افراد کو سپرد کی جائے جو ان علوم کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام کے قدر دان اور کم از کم ذہنی طور پر سچے اور پکے مسلمان ہوں۔

جب تک نصاب تعلیم میں مذکورہ دو چیزوں کی رعایت نہیں کی جائے گی اس وقت تک ایک گھنٹے میں اسلامیات کی تعلیم پاکستان کے نظریاتی مقاصد کو خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچا سکے گی۔ اس بات کی نشاندہی قدرے تفصیل کے ساتھ اس لئے کر دی گئی ہے کہ زیر تبصرہ تعلیمی پالیسی میں اسلامیات کو دسویں جماعت تک لازمی قرار دینے کا تو ذکر ہے لیکن نظام تعلیم کو اسلامی بنانے کے ان دو لوازم یعنی نصاب کی تدوین نو اور اسلامی ذہنیت کی تعمیر موجود نہیں ہے۔ امید ہے کہ پالیسی کے مبارک مقاصد حاصل کرنے کے لئے ان دو بنیادی باتوں کو کماحقہ اہمیت دی جائے گی۔

۳۔ اسلامیات کی تعلیم

مذکورہ دو باتیں اسلامیات کے علاوہ دوسرے مضامین سے متعلق تھیں اسلامی نظام تعلیم میں خاص اسلامیات کے مضمون کو جو اہمیت حاصل ہونی چاہئے وہ محتاج بیان نہیں۔ زیر تبصرہ پالیسی کے مرتبین نے اس ضرورت کو محسوس کر کے حصہ اول باب اول کے فقرہ نمبر ۴ میں اسلامیات کو دسویں

جماعت تک لازم کرنے کی سفارش کی ہے یہ سفارش ہر لحاظ سے قابل مبارکباد ہے البتہ اس ضمن میں چند باتیں قابل ذکر ہیں۔

(الف) معیار کی بلندی

خلاصہ کے پیراگراف نمبر ۵ میں فاضل مرتبین نے یہ تسلیم کیا ہے کہ اسلامیات کے آٹھویں جماعت تک لازمی ہونے کے باوجود جدید نظام تعلیم ہمارے یہاں اب تک لادینی رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو وہی تھی جو ہم نے اوپر تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ خاص اسلامیات کے گھنٹے میں جو نصاب پڑھایا جاتا ہے اس کا معیار اتنا پست رہا ہے اس کے ذریعہ اسلامی تعلیمات کا ہزارواں حصہ بھی طالب علم کو معلوم نہیں ہو پاتا۔ اسلامیات کا صحیح مفہوم علم عقائد. علم تفسیر و اصول تفسیر. علم حدیث و اصول حدیث. علم فقہ و اصول فقہ پر مشتمل ہے۔ اسلامیات کے نصاب میں بھی یہی چیزیں تدریجی انداز میں اعلیٰ معیار تک پڑھانے کی ضرورت ہے۔ ورنہ محض اسلام کی برتری کے چند مجمل اور کھوکھلے الفاظ رٹنے سے اسلامیات کی تعلیم کا مقصد کبھی حاصل نہیں ہوگا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دسویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے طالب علم کم از کم اسلامی تعلیمات سے اتنا واقف ہو جائے کہ اپنی روزمرہ کی زندگی سے متعلق اسلام کی ہدایات ذہن نشین کرلے۔ اور اسلام نے زندگی کے ہر شعبے سے متعلق جو ہدایات دی ہیں۔ ان کے مبادی سے واقف ہو جائے۔ اس سلسلہ میں سلیبس کا معیار تجویز کر کے اس یادداشت کے ساتھ منسلک کیا جارہا ہے۔

(ب) ناظرہ قرآن کریم

سابقہ حکومت مغربی پاکستان نے تمام اسکولوں میں ناظرہ قرآن کریم کو آٹھویں جماعت تک لازمی کر دیا تھا اور اس کا گھنٹہ اسلامیات کے ساتھ ضم کر دیا گیا۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ پانچویں جماعت تک اسلامیات کے گھنٹے کے علاوہ حسب سابق ناظرہ قرآن کریم کا بقدر ضرورت مستقل وقت ہونا چاہئے۔ ہمارا تجربہ ہے کہ اگر پڑھانے والے اساتذہ کماحقہ توجہ کے ساتھ پڑھائیں تو ناظرہ قرآن دوسرے مضامین کے ساتھ پانچویں جماعت تک اطمینان سے ختم ہو سکتا ہے۔ اس کی عملی صورت بھی ان تجاویز کے ساتھ پانچویں جماعت تک کے نصاب تعلیم کے نقشے میں منسلک ہے۔ اسلامیات اور قرآن مجید کی تعلیم میں یہ بات بھی نہایت ضروری ہے کہ امتحانات میں ان کو وہ حیثیت دی جائے جو اردو اور حساب کو حاصل ہے۔ یعنی اگر ان میں سے کسی مضمون میں طالب علم فیل ہو جائے تو اسے آگے ترقی

نہ دی جائے۔ موجودہ نظام تعلیم میں چونکہ اسلامیات کے امتحان کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے اس لئے اس کی خاطر خواہ اہمیت طالب علم کے ذہن میں پیدا نہیں ہوتی۔

(ج) کالج کی سطح پر اسلامیات کی فیکلٹی

پالیسی کے حصہ اول باب نمبر ۴ میں کہا گیا ہے کہ دسویں جماعت کے بعد اسلامیات کی تعلیم اختیاری ہونی چاہئے۔

یہ سفارش ہماری نظر میں بالکل درست ہے لیکن اس کی صحیح عملی شکل یہ ہے کہ اسلامیات کے لئے آرٹس، سائنس اور کامرس کی طرح ایک مستقل کلیہ (FACULTY) قائم کیا جائے۔ پالیسی کے مذکورہ فقرہ میں کالج کی سطح پر اسلامیات کی تعلیم کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ:۔

"تاکہ جو طلباء اسلامیات کو اختیار کریں انہیں پوسٹ گریجویٹ کی سطح تک اسلامی تحقیق کا کام کرنے کا موقع ملے۔"

یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ اسلامیات کا ایک مستقل کلیہ قائم کیا جائے اور اس میں اسلامی علوم کی وسیع و عمیق تعلیم کے ذریعہ طلباء کو اسلامی تحقیق کا اہل بنایا جائے اس کے بغیر وہ اس مقصد کی کوئی خدمت نہیں کر سکیں گے۔

(د) عربی تعلیم

اب تک ہمارے یہاں اول سے آخر تک اسلامیات کو عربی سے الگ کر کے پڑھایا گیا ہے حالانکہ اسلامیات کی صحیح تعلیم عربی کے بغیر بالکل بے معنی ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی میں تصریح کی گئی ہے کہ اسلامیات کی تعلیم کا مقصد اسلامی علوم کے محقق، اور صاحب نظر عالم پیدا کرنا ہے لیکن ہر شخص جسے اسلامی علوم سے ادنیٰ واقفیت ہے یہ بات تسلیم کرے گا کہ یہ مقصد عربی زبان وادب اور گرامر کی ٹھوس اور معیاری تعلیم کے بغیر بالکل ناممکن ہے۔ لہٰذا ہماری تجویز یہ ہے کہ عربی زبان کو اسلامیات کا لازمی جزو ہونا چاہئے۔ جس کی عملی شکل ثانوی مدارس کے مجوزہ سلیبس میں لکھ دی گئی ہے۔ عربی زبان کو نصاب میں اہمیت دینے سے اسلامیات کے علاوہ اردو زبان وادب کی تعلیم میں بھی مدد ملے گی اور عالم اسلام کے ساتھ ہمارا رابطہ مستحکم ہوگا۔

(ہ) اساتذہ کا معیار

اب تک اسلامیات کی تعلیم میں جو نقائص رہے ہیں ان کا ایک بڑا سبب اساتذہ کی کمی اور ان کی تربیت کا فقدان بھی رہا ہے اسلامیات کا جتنا تھوڑا بہت حصہ نصاب میں رکھا گیا تھا وہ بھی غیر تربیت یافتہ اساتذہ کی وجہ سے پورا نہیں ہوتا تھا اس کمی کو دور کرنے کے لئے ہماری تجاویز حسب ذیل ہیں۔

(ا) آئندہ کے لئے اسلامیات کے اساتذہ میں مطلوبہ قابلیت کا یہ معیار مقرر کر دیا جائے۔

(الف) ساتویں جماعت تک کے اساتذہ کے لئے دینی مدارس سے ثانوی مرحلے کا سند یافتہ یا اسلامیات کی مجوزہ فیکلٹی سے انٹرمیجیٹ یا موجودہ نظام تعلیم کا گریجویٹ جس کا اختیاری مضمون اسلامیات رہا ہو۔ اور اس نے اسلامیات کی تدریس کی خصوصی تربیت لی ہو۔

(ب) آٹھویں سے دسویں تک کی جماعتوں کے لئے دینی مدارس سے ثانوی مرحلے کا سند یافتہ جو المنٹری کلاسوں کو پڑھانے کا کم از کم تین سالہ تجربہ رکھتا ہو یا اس نے علوم جدیدہ کی خصوصی تربیت حاصل کی ہو۔ یا اسلامیات کی مجوزہ فیکلٹی سے گریجویٹ یا موجودہ نظام تعلیم کا فاضل عربی، یا موجودہ نظام تعلیم کا ایم اے اسلامیات جس نے اسلامیات کی خصوصی تربیت لی ہو۔

(ج) گریجویشن تک کی تعلیم کے لئے دینی مدارس کے اعلیٰ مرحلے کا سند یافتہ جس نے جدید علوم کی خصوصی تربیت لی ہو یا اسلامیات کی مجوزہ فیکلٹی سے ایم اے۔

(د) ایم اے کی تعلیم کے لئے وہ شخص جو دینی مدارس کے ثانوی مرحلے میں تدریس کا کم از کم سات سالہ یا اعلیٰ مرحلے میں تدریس کا کم از کم دو سالہ تجربہ رکھتا ہو یا دینی مدارس کی درجات تخصص کا فارغ ہو یا اسلامیات کی فیکلٹی سے ایم اے اور گریجویشن تک کی تعلیم کا مناسب تجربہ رکھتا ہو۔

(و) اساتذہ کی خصوصی تربیت

"اساتذہ کے معیار کے تحت ضمن الف و ب و ج میں اساتذہ کی خصوصی تربیت کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کی تشریح درج ذیل ہے۔

(ا) جب تک مجوزہ پالیسی کے تحت علوم اسلامیہ و عربیہ کے مستند تعلیم پائے ہوئے لوگ اسلامیات کی تدریس کے لئے مہیا نہیں ہوتے اس وقت تک موجودہ نظام تعلیم کے ان افراد سے بھی کام لیا جا سکتا ہے، جنھوں نے ماضی میں ابتداء سے گریجویشن تک معارف اسلامیہ (اسلامک اسٹڈیز) کو بطور

اختیاری مضمون لیا ہو، لیکن ان کے لئے تربیت کا ایک کورس ترتیب دیا جائے جس میں ناظرہ قرآن کریم ابتدائی عربی زبان و گرامر ترجمہ قرآن کریم اور حدیث و فقہ کے مبادی پڑھانے کی تربیت دی جائے۔ اس تربیت میں کامیاب ہونے کے بعد انہیں تدریس کا اہل قرار دیا جائے۔ اس تربیتی کورس کا انتظام دینی مدارس میں کیا جائے اس طرح قدیم و جدید طبقوں کے درمیان باہمی ربط اور ہم آہنگی پیدا کرنے میں بھی مدد ملے گی۔ اس سلسلے میں دینی مدارس ہر قسم کا تعاون کرنے کے لئے تیار ہیں۔

(۲) جب تک مجوزہ پالیسی کے تحت دینی مدارس کے طلباء جدید علوم سے واقف ہو کر فارغ نہیں ہوتے اس وقت تک گریجویشن کی اسلامیات کی تعلیم کے لئے ان افراد سے بھی کام لیا جا سکتا ہے، جو ماضی میں کسی معروف دینی درس گاہ سے فارغ ہوئے ہیں، لیکن ان کے لئے تربیت کا ایک کورس ترتیب دیا جائے جس میں انہیں جدید علوم سے روشناس کرایا جائے۔ اس کے بعد انہیں تدریس کا اہل قرار دیا جائے۔

(۳) مجوزہ پالیسی کے تحت دینی مدارس میں ریاضی اور سائنس کے جو مضامین داخل نصاب کئے جائیں گے ان کو پڑھانے کے لئے دینی مدارس کے موجودہ اساتذہ ہی کو تربیت دی جائے۔ جیسا کے زیر تبصرہ پالیسی میں تجویز کیا گیا ہے۔

(۴) آئندہ مستقل طور پر تربیت اساتذہ کے تمام مراحل میں بشمول بی ایڈ اور ایم ایڈ اسلامیات کی تربیت کا مستقل اور ٹھوس نظام بنایا جائے۔

(۵) جب تک کسی درسگاہ میں اسلامیات اور ناظرہ قرآن کریم کے تربیت یافتہ اساتذہ موجود نہ ہوں اس وقت تک اسے سرکاری طور پر منظور نہ کیا جائے۔

۴۔ درسگاہوں کا ماحول

اپنے نظام تعلیم کو صحیح معنی میں اسلامی اور قومی انداز میں نافذ کرنے کے لئے جتنی اہمیت نصاب تعلیم کو حاصل ہے، درسگاہوں کے ماحول کا سدھار اس سے کم اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ طلباء کو کسی خاص رنگ میں رنگنے کے لئے اس کا ماحول بڑا موثر ثابت ہوتا ہے مغربی ممالک میں اسلامیات کی تعلیم اچھے خاصے معیار پر ہوتی ہے۔ لیکن اس کے ذریعہ کوئی مسلمان طالب علم پیدا نہیں ہوا۔ اس کی وجہ اسلامی ماحول کا فقدان ہے۔ لہٰذا نئے نظام تعلیم میں اس امر کو بھی پوری اہمیت دینے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ہماری تجاویز درج ذیل ہیں:

(الف) اساتذہ

مسلمان طلباء کو تعلیم دینے کے لئے ایسے اساتذہ کا انتخاب ناگزیر ہے، جو ایک طرف اپنے تدریسی مضامین میں ماہر اور اپنے علم وفن کا ذوق رکھنے والے ہوں اور دوسری طرف نظریہ پاکستان یعنی اسلام سے کماحقہ عقیدت ومحبت رکھتے ہوں۔

خاص طور سے اسلامیات کی تعلیم کے لئے اساتذہ کا انتخاب کرتے وقت اس بات کو لازمی شرط قرار دیا جائے کہ وہ اپنی ظاہری عملی زندگی میں اسلامی تعلیمات کے پابند ہوں ورنہ ظاہر ہے کہ وہ طلباء کے اندر اسلامی روح پھونکنے میں ناکام رہیں گے۔

(ب) جداگانہ تعلیم

اب تک ہمارے نظام تعلیم کے غیر اسلامی ہونے کی ایک بڑی وجہ مخلوط تعلیم بھی رہی ہے۔ طلباء اور طالبات کو مشترک طور پر ایک ساتھ تعلیم دینا مندرجہ ذیل وجوہ سے غلط اور خطرناک ہے۔

(۱) مرد و عورت کا یہ اختلاط ان اسلامی تعلیمات کے یکسر مخالف ہے جن کے سانچے میں ہم اپنے نظام تعلیم کو ڈھالنا چاہتے ہیں۔ امید ہے کہ زیر تبصرہ پالیسی کے فاضل مرتبین جنکی پر خلوص کوشش یہ ہے کہ ہمارا نظام تعلیم اسلامی بنیادوں پر استوار ہو جائے. لادینی تعلیم کی اس خطرناک ترین یادگار کو مٹانے کی طرف خصوصی توجہ دیں گے (۲) مخلوط تعلیم کی وجہ سے تعلیم کا معیار بہت پست ہو گیا ہے (۳) قدرت نے مرد و عورت کو الگ الگ مقاصد کے لئے پیدا کیا ہے۔ لہٰذا دونوں کی تعلیم بھی ان کے مقاصد حیات کے لحاظ سے مختلف ہونی چاہئے۔ جو نصاب و نظام مرد کے لئے مفید ہو سکتا ہے ضروری نہیں ہے کہ وہ عورت کے لئے بھی مفید ہو۔ اس وجہ سے عورتوں کا نظام تعلیم مردوں سے بالکل الگ ہونا چاہئے۔ موجودہ نظام تعلیم میں دونوں کو یکساں طرز سے تعلیم دی جاتی ہے، جو نتائج کے لحاظ سے مفید نہیں ہو سکتی (۴) مخلوط تعلیم کی وجہ سے طلباء میں جو اخلاقی گراوٹ مسلسل پیدا ہو رہی ہے وہ اب کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں رہی۔ ان حالات میں ہمارا نظام تعلیم اس وقت تک ہمارے قومی تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا جب تک کو مرد و عورت کے لئے الگ الگ نصاب اور نظام نہ بنایا جائے۔

(ج) غیر نصابی سرگرمیاں

طلباء کے ماحول کو درست کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ان کو غیر نصابی سرگرمیوں میں کسی ایسی بات کی اجازت نہ دی جائے جو اسلامی تعلیمات کے منافی ہو۔ سابقہ حکومت مغربی پاکستان

نے اپنے تعلیمی اداروں میں رقص و سرود پر پابندی عائد کر دی تھی یہ ایک نہایت مستحسن اقدام تھا جس پر کماحقہ عمل نہ ہو سکا۔ ضرورت ہے کہ نئے نظام تعلیم میں رقص و سرود اور دوسری غیر اسلامی سرگرمیوں پر پابندی لگادی جائے۔ اسکے علاوہ ایسی غیر نصابی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے جن میں طلباء کو اسلامی معلومات بڑھانے یا اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے میں مدد ملے۔

(د) یونیفارم

پورے پاکستان میں اگر طلباء کا یونیفارم ایک کر دیا جائے تو اس سے بھی قومی شعور پیدا کرنے میں مدد ملے گی۔ دنیا کی تمام زندہ قومیں اپنی نسلوں میں قومی اور اجتماعی احساس پیدا کرنے کے لئے ان کو اپنے قومی لباس کا پابند بناتی ہیں۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ پاکستان کے طلباء اس شعور سے محروم رہیں۔ اس لئے ان کا یونیفارم پاکستان کا قومی لباس یعنی شیروانی پاجامہ یا شلوار اور ٹوپی ہونا چاہئے۔

(ہ) شعائر اسلام کا احترام

درس گاہوں کے ماحول میں اسلامی ارکان و شعائر کے کماحقہ احترام کی مکمل رعایت ہونی چاہئے۔ نمازوں کی اوقات میں نماز کے لئے مناسب وقفے ہونے چاہئیں اور بہتر ہے کہ درس گاہ کی حدود عمارت میں مسجد کے قیام کو لازمی قرار دیا جائے اگر مستقل عمارت نہ ہو تو نماز با جماعت کے لئے الگ جگہ بنائی جائے اور اس بات کی کوشش کی جائے کہ طلباء جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے عادی بنیں۔

(و) ہفتہ وار تعطیل

اس ضمن میں یہ بات بھی نہایت ضروری ہے کہ درس گاہوں کی ہفتہ وار تعطیل کا دن اتوار کے بجائے جمعہ کو مقرر کیا جائے۔

عربی مدارس کا مسئلہ

پالیسی کے خلاصہ کے پہلے اور آخری پیراگرافوں میں قدیم و جدید نظام ہائے تعلیم پر جو تبصرہ کیا گیا ہے وہ بلاشبہ دونوں نظاموں پر مختصر مگر جامع تبصرہ ہے حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں نظاموں کے درمیان جو وسیع خلیج حائل ہو گئی ہے اسے دور کرنے کی ضرورت عرصہ دراز سے محسوس کی جا رہی ہے لیکن جیسا کہ پالیسی کے خلاصہ پیراگراف نمبر ۵ میں کہا گیا ہے کہ " پاکستان کا مقصود نظریاتی اتحاد ہونا چاہئے نظریاتی

خلاء نہیں۔" اس لئے اس خلیج کو دور کرنے کے لئے بڑی حکمت کی ضرورت ہے۔ جہاں تک جدید نظام تعلیم میں اسلامی اصلاحات کا تعلق ہے ان کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔ دینی مدارس کے نظام تعلیم کو منظم مربوط اور پاکستان کے لئے زیادہ مفید بنانے کے لئے ہماری تجاویز حسب ذیل ہیں:۔

(ا) مدرسہ ایجوکیشن بورڈ

مدارس کو منظم کرنے کے لئے ایک آزاد خود مختار مدرسہ تعلیمی بورڈ کی تشکیل کی جائے لیکن سابقہ تجربات کے پیش نظر اس بورڈ میں حسب ذیل امور کی رعایت کی جائے۔ ورنہ یہ تنظیم قطعی طور پر ناکام ہو جائے گی۔

(الف) یہ بورڈ تمام تر موجودہ بڑے دینی مدارس کے ایسے ذمہ دار علمائے دین پر مشتمل ہو جن پر خود یہ دینی مدارس اور پوری امت علم و فضل اور دینی بصیرت کے لحاظ سے اعتماد کرتی ہو البتہ جدید علوم کے معاملے میں مشورہ لینے کے لئے دو ایسے صاحبان بھی اس کے رکن. ہوں جو جدید نظام تعلیم کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔

(ب) ہر دینی مدرسہ اپنے یہاں بنیادی (المنٹری) مرحلے کا اسکول قائم کرے جس میں وہی نصاب پڑھایا جائے جو عام سرکاری اسکولوں میں پڑھایا جارہا ہو۔ اس مرحلے تک جدید وقدیم نظام تعلیم کا فرق بالکل ختم کر دیا جائے البتہ دینی مدارس کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ اپنی ضرورت کی تحت اس نصاب پر کچھ اضافہ کرنا چاہیں تو کر سکیں اور دینی مدارس کے خاص نظام تعلیم میں ان ہی طلباء کو داخلہ دیا جائے جو المنٹری کلاسوں سے فارغ ہو چکے ہوں۔

(ج) دینی مدارس کے خاص نصاب تعلیم کو چار مراحل پر تقسیم کیا جائے علوم ابتدائیہ. علوم ثانیہ. علوم عالیہ اور علوم تخصص. ان مراحل میں بورڈ اپنی صوابدید پر معاشیات. سیاسیات. اور جدید فلسفہ کے مضامین شامل کرے۔ .

(د) بورڈ کو نصاب تعلیم کے تقرر. امتحانات کے انعقاد اور جملہ تعلیمی امور میں مکمل آزادی اور خود مختاری حاصل ہو۔ اور اس معاملے میں وہ کسی ہیئت حاکمہ کا پابند نہ ہو۔ زیر تبصرہ پالیسی میں بعض معیاری کالجوں کو اس قسم کی آزادی دی گئی ہے کہ وہ خود امتحانات لیں اور ڈگری دیں۔ لہٰذا مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کو خود مختار رہتے ہوئے اسناد عطا کرنے کی اجازت دینا ایک معقول تجویز ہے۔

(ہ) موجودہ نظام میں دینی مدارس عوامی تعاون کی بنیاد پر چل رہے ہیں اگر ان مدارس کی موجودہ آزادی میں کوئی فرق آیا یا حکومت نے ان کو مالی امداد دی تو یقین ہے کہ عوامی تعاون کا یہ سلسلہ بالکل بند ہو جائے گا اور ان مدارس کو چلانے کے لئے حکومت کو کروڑوں روپیہ خرچ کرنا پڑے گا جس

کے بارے میں یقین ہے کہ میزانیہ میں اس کی گنجائش نہیں ہوگی۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ دینی مدارس ایک طرف اپنے تعلیمی معاملات میں مکمل طور پر آزاد ہوں اور دوسری طرف ان کا مالی نظام جس طرح آج کل عوامی تعاون کی بنیاد پر چل رہا ہے۔ اسی طرح چلتا رہے۔ مرکزی بورڈ کے جملہ اخراجات دینی مدارس کے چندے سے پورے کئے جائیں۔

(و) اس بورڈ کی دی ہوئی اسناد کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے اور ابتدائی مرحلے کو میٹرک کے مساوی، ثانوی مرحلے کو انٹر کے مساوی۔ اعلیٰ مرحلے کو گریجویٹ کے مساوی اور تخصص کو ایم اے کے مساوی قرار دیا جائے۔

(ز) دینی مدارس کے اس بورڈ کے تسلیم کر لینے کے بعد ادیب، عالم اور فاضل کے امتحانات اور اسناد کو ختم کر دیا جائے۔

(ح) ملک کے بہت سے دینی مدارس و مکاتب ایسے ہیں کہ جو نہایت محدود پیمانے پر اپنا کام کر رہے ہیں اپنے محدود مالی وسائل کی وجہ سے ان کا بورڈ کے پورے نظام میں منسلک ہونا ممکن نہیں ہوگا لہٰذا جو مدارس اس بورڈ کے ساتھ منسلک نہ ہو سکیں ان کو رجسٹر کر لیا جائے لیکن سند کی منظوری کے لئے بورڈ سے ملحق ہونا لازمی ہو۔

یہ نکات اس قدر ناگزیر ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو بھی فراموش کر دیا گیا تو تنظیم مدارس کے مقصد پر بالکل پانی پھر جائے گا۔ اور یا تو موجودہ خلیج جوں کی توں برقرار رہے گی یا ملک میں ایک خوفناک نظریاتی خلاء پیدا ہو جائے گا۔

مشنری تعلیمی ادارے

اس میں ذرہ برابر شک و شبہ اور تردد کی گنجائش نہیں کہ پاکستان میں مشنری تعلیمی ادارے اور رفاہی ادارے درحقیقت مسیحی تبلیغی ادارے ہیں یا زیادہ بہتر الفاظ میں مسیحیت کی تبلیغ کے چور دروازے ہیں۔ جن کے ذریعہ عیسائی مبلغ نہایت خاموش طریقے پر انتہائی سرگرمی کے ساتھ پاکستان میں عیسائیت کے بیج بو رہے ہیں۔ اس مشنریوں کی کارکردگی کی سالانہ رپورٹوں سے ظاہر ہے کہ پاکستان بننے کے بعد اس بائیس سال کی مدت میں پاکستانی باشندوں کو عیسائی بنانے میں اتنی زبردست کامیابی ان مشنریوں کو حاصل ہوئی ہے کہ پورے صد سالہ برطانوی دور استعمار میں پورے برصغیر ہندوستان میں اتنی کامیابی نہیں ہوئی تھی چنانچہ مسیحی اقلیت کی وہ تعداد کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔ اگر ان ملکی اور غیر ملکی مشنریوں کو اسی طرح خاموشی کے ساتھ کام کرنے دیا گیا تو قوی اندیشہ ہے کہ مستقبل قریب یا بعید:

مسیحی اقلیت ایسی موثر اقلیت بن جائے کہ اس نوزائدہ خالص اسلامی مملکت کے لئے مستقل خطرہ اور درد سر بن جائے اور پاکستان کا وہی حشر ہو جو لبنان کا ہو چکا ہے یا انڈونیشیا میں ہو رہا ہے۔

اس لئے نئی تعلیمی پالیسی کا مشنری تعلیمی اداروں کے خلاف صرف اتنا اقدام ہر گز کافی نہیں کہ تمام ملکی مشنری تعلیمی اداروں کو قومی ملکیت میں لے لیا جائے۔ بلکہ ملکی مشنری تعلیمی اداروں پر بھی کڑی نگرانی رکھنے کی سفارش کرنی چاہیے۔ اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے تحت پاکستانی مشنریوں کو صرف اتنی اجازت دی جاسکتی ہے کہ وہ محض عیسائیوں کی تعلیم کے لئے اسکول و کالج اس شرط کے ساتھ قائم رکھ سکتے ہیں کہ

الف: ان کا نصاب تعلیم، نظام تعلیم بالکل وہی ہو جو پاکستانی سرکاری اسکولوں میں رائج ہے اور ان کی تعلیمی سرگرمیوں میں اسلام، پیغمبر اسلام اور تعلیمات اسلام کے خلاف ایک لفظ نہ کہا جائے۔ وہ مسیحی معتقدات عیسائی بچوں کو سکھا سکتے ہیں اس شرط کے ساتھ اسلامی معتقدات کی تنقیص یا ان پر تنقید بالکل نہ کی جائے۔

ب: ان مشنری اسکولوں میں مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کو ہر گز داخل نہ کیا جائے۔

ورنہ موجودہ تعلیمی پالیسی کے تحت ملکی مشنریوں کو مستثنیٰ کر دینے کی صورت میں غیر ملکی مشنریاں اپنے تمام تعلیمی اداروں اور اثاثوں کا مالک ان مشنریوں کو بنا کر ان کے واسطہ سے اپنے موجودہ تبلیغی مشن کو جاری رکھ سکیں گی۔ اور اسلامی حکومت اس استثناء کی وجہ سے ان کے خلاف کچھ نہ کر سکے گی۔

تعلیم بالغان

زیر تبصرہ تعلیمی پالیسی کے حصہ اول باب دوم میں تعلیم بالغان کی اہمیت پر جو زور دیا گیا ہے وہ قابل مبارک باد ہے اور اس سلسلے میں نوجوانوں سے جو رضا کارانہ خدمات لینے کا طریقہ تجویز کیا گیا ہے اگر اس پر عمل ہو سکا تو اس سے ایک عام قومی بیداری اور اجتماعی شعور کو ترقی دینے میں بھی مدد ملے گی۔ اس سلسلے میں ہماری دو تجاویز ہیں۔

(۱) تعلیم بالغان کے نصاب میں ناظرہ قرآن کریم اور ضروری اسلامی معلومات (جس کے ذریعہ وہ اسلام کے بنیادی عقائد و ارکان سے واقف ہو جائیں) ضرور داخل کئے جائیں۔

(۲) جس حد تک ممکن ہو تعلیم بالغان کا مرکز مساجد کو قرار دیا جائے۔

(۳) تعلیم بالغان کے لئے نوجوانوں کی رضا کارانہ خدمات کا جو طریقہ تجویز کیا گیا ہے۔ وہ صرف (مرد) طلباء کے لئے رکھا جائے۔ طالبات کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

مخلوط تعلیم

تعلیم نسواں ایک مستقل چیز ہے اور مخلوط تعلیم ایک جداگانہ چیز ہے ان دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ خلط وہی بے دین اور بے حمیت یورپ زدہ لوگ کرتے ہیں جو فروغ تعلیم نسواں کی آڑ میں مخلوط تعلیم کو فروغ دینا اور عام کرنا چاہتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات کی حدود میں رہ کر تعلیم نسواں کو زیادہ سے زیادہ عام کرنا چاہئے تاکہ نئی نسل اعلیٰ اخلاق و کردار کی مالک بن سکے۔ مگر معاشی اعانت کے لئے عورتوں کی تعلیم کو ذریعہ بنانا غیر فطری بھی ہے اور غیر اسلامی بھی اس لئے کہ قرآن حکیم بیوی بچوں کی معاشی کفالت کا ذمہ دار مرد کو قرار دیتا ہے اور اسلامی تعلیمات کی رو سے عورت کی ذمہ داری شرعی فرائض ادا کرنے کے بعد تمام جائز اور مباح امور میں شوہر کی اطاعت کرنا اس کی حوائج اور سامان راحت و آسائش کو مہیا کرنا ہے تاکہ بچے اور شوہر تفریح کے لئے گھر سے باہر جانے کی ضرورت ہی محسوس نہ کریں۔

ایک ایسی تعلیم یافتہ عورت جس کا دن کسب معاش میں گھر سے باہر گزرے شام کو تھکی ہاری مر آئے ہرگز ان فطری اور شرعی ذمہ داریوں کو نہیں اٹھاسکتی۔ اس لئے عورتوں کو معاشی نقطہ نظر سے تعلیم دینے کا تصور ایک قطعی غلط تصور ہے۔ لڑکیوں کا نصاب تعلیم، نظام تعلیم اور معیار تعلیم مذکورہ بالا مقاصد کے تحت مرتب ومدون اور مردوں سے بالکل الگ اور جداگانہ ہونا چاہئے۔ ایسی صورت میں درس گاہوں کا الگ ہونا ناگزیر ہے۔ اگر تعلیم نسواں سے اس کے صحیح فوائد حاصل کرنے ہیں تو مخلوط تعلیم کو ختم کرنا قطعی لازمی ہے۔ اس لئے کہ مخلوط تعلیم تو اسلامی روح کے بھی قطعی منافی ہے اور ذہنی وفکری آسودگی اور اخلاق و پاکیزگی کے لئے بھی سم قاتل ہے اس کی اجازت کسی صورت میں بھی نہیں دی جاسکتی۔

عام طور پر تعلیم نسواں کے فروغ کے حامی وہ یورپ زدہ لوگ ہیں جو پاکستان کو بھی مخلوط تعلیم کے ذریعہ فحاشی و عریانی کے لحاظ سے پیرس اور بیروت کا نمونہ بنانا چاہتے ہیں یہ لوگ درحقیقت تعلیم نسواں کے بھی دشمن ہیں اور دین وایمان کے بھی دشمن۔

رجال کار

یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ دنیا کا کوئی نظام خواہ کتنا ہی بہتر سے بہتر کیوں نہ ہو اس وقت تک نتیجہ خیز اور بار آور ثابت نہیں ہو سکتا جب تک اس کو چلانے والے رجال کار موزوں اور صحیح نہ ہوں اگر

ـ ،ایسا نظام تعلیم جو نظریاتی اعتبار سے سرتاپا مفید ہو، غلط ہاتھوں کو سونپ دیا جائے تو وہی ہلاکت خیز بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

لہٰذا اگر ملک کا نظام تعلیم اسلامی خطوط پر استوار کرنا ہے تو یہ بات بنیادی اہمیت رکھتی ہے کہ اس نظام کو چلانے والے افراد اسلام کا صحیح جذبہ رکھنے والے ہوں۔ نیز اسلامیات کے نصاب کی تدوین صرف ان علماء کو تفویض کی جائے جو اسلامی علوم کا وسیع اور عمیق علم اور تجربہ رکھتے ہوں۔ اس سلسلے میں ہماری تجاویز درج ذیل ہیں۔

(۱) یونیورسٹی اور ثانوی تعلیمی بورڈ کے تمام انتظامی شعبوں کے عہدے صرف ان لوگوں کے سپرد کئے جائیں جو نظریہ پاکستان یعنی اسلام سے عقیدت و محبت رکھتے ہوں اور تعلیم کے مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت کے حامل ہوں۔

(۲) مندرجہ ذیل امور کے لئے صرف ان مستند علمائے دین کا انتخاب کیا جائے جنکے علم و فضل اور فہم و بصیرت پر قوم اعتماد کرتی ہے۔

(الف) تمام مراحل تعلیم کے لئے اسلامیات کے نصاب کمیٹی۔

(ب) اسلامیات کی نصابی کتب کی تصنیف اور تدوین۔

(ج) معارف اسلامیہ کی فیکلٹی کے تمام شعبے۔

(د) سنڈیکیٹ میں اسلامیات کی فیکلٹی ڈین کو بھی شامل کیا جائے

خلاصہ تجاویز

اب ہم ذیل میں ان تجاویز کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جو اس یادداشت میں ذکر کی گئی ہیں۔

(۱) تعلیم کا نظام اور نصاب اس طرز پر بنایا جائے کہ طلباء کے سامنے جو تعلیم کا مقصد آئے وہ محض حصول معاش نہ ہو بلکہ ذات کی تکمیل، اعلیٰ انسانی اوصاف کا حصول اور ملک و ملت کی خدمت ہو۔

(۲) نظام تعلیم کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ صرف ایک گھنٹے میں اسلامیات کو لازمی قرار دیا جائے بلکہ اس کے لئے ہر علم و فن کے نصاب کو اس طرز پر مدون کرنے کی ضرورت ہے کہ:۔

(الف) اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے افکار ہر علم و فن میں رچے بسے ہوئے ہوں۔

(ب) ہر علم و فن کی تعلیم اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر کے ساتھ دی جائے ان دونوں باتوں کی پوری تفصیل و تشریح ابتدائی صفحات میں بیان کی گئی ہے۔

(۳) اسلامیات کی تعلیم کا معیار بلند کیا جائے اور اس میں تفسیر، حدیث، فقہ، اور عقائد کی ٹھوس تعلیمات اتنی مقدار میں دے دی جائیے کہ دسویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے ہر طالب علم کے سامنے اسلام کی ایک صحیح اجمالی تصویر آجائے۔ اس کا مجوزہ سلیبس منسلک ہے۔

(۴) پانچویں جماعت تک ناظرہ قرآن کریم کے لئے اسلامیات سے الگ مستقل وقت رکھا جائے۔ اور اس مرحلے تک قرآن کریم ختم کرادیا جائے۔ اس کی عملی صورت پانچوین جماعت کے سلیبس میں منسلک ہے۔

(۵) کالج کی سطح پر اسلامیات کی مستقل فیکلٹی قائم کی جائے جس میں تمام اسلامی علوم کی وسیع و عمیق تدریس کا انتظام ہو۔

(۶) عربی زبان کو اسلامیات کی تعلیم کا مستقل جزبنایا جائے جس کی عملی صورت ثانوی مدارس کے سلیبس میں منسلک ہے۔

(۷) اسلامیات کے اساتذہ میں مطلوبہ قابلیت کا یہ معیار مقرر کیا جائے کہ:

(الف:۔ ساتویں جماعت کے اساتذہ کے لئے دینی مدارس سے ثانوی مرحلے کا سندیافتہ یا اسلامیات کی مجوزہ فیکلٹی سے انٹرمیڈیٹ یا موجودہ نظام تعلیم کا گریجویٹ جس کا اختیاری مضمون معارف اسلامیہ رہا ہو اور اس نے اسلامیات کی تدریس کی خصوصی تربیت لی ہو۔

(ب:۔ آٹھویں سے دسویں جماعت تک کے لئے دینی مدارس سے ثانوی مرحلے کا سندیافتہ جو انٹری کلاسوں کو پڑھانے کا کم از کم تین سالہ تجربہ رکھتا ہو یا علوم جدیدہ کی خصوصی تربیت لی ہو۔ یا اسلامیات کی مجوزہ فیکلٹی سے گریجویٹ یا موجودہ نظام تعلیم کا فاضل عربی۔ یا موجودہ نظام تعلیم کا ایم اے اسلامیات جس نے اسلامیات کی خصوص تربیت لی ہو۔

ج:۔ گریجویشن تک کتابوں کے لئے دینی مدارس کے اعلیٰ مرحلہ کا سندیافتہ جس نے جدید علوم کی خصوصی تربیت لی ہو یا اسلامیات کی مجوزہ فیکلٹی سے ایم اے ہو۔

د:۔ ایم اے کی تدریس کے لئے وہ شخص جو دینی مدارس کے ثانوی مرحلہ میں تدریس کا کم از کم سات سالہ یا اعلیٰ مرحلہ میں تدریس کا کم از کم دو سالہ تجربہ رکھتا ہو یا اسلامیات کی مجوزہ فیکلٹی میں گریجویشن تک تعلیم کا کم از کم پانچ سالہ تجربہ رکھتا ہو یا دینی مدارس کے درجات تخصص کا فارغ ہو۔

(۸) تجویز سات ضمن الف و ب میں جس خصوصی تربیت کا ذکر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ

موجودہ نظام تعلیم سے معارف اسلامیہ کی تعلیم پائے ہوئے لوگوں کے لئے تربیت کا ایک خصوصی کورس شروع کیا جائے جس کا انتظام بہتر ہے کہ دینی مدارس میں ہو۔

(۹) تجویزے ضمن ج و د میں جس خصوصی تربیت کا ذکر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ دینی مدارس کے ان طلباء کو جو ماضی میں فارغ التحصیل ہوئے ہوں. بعض ضروری دنیوی علوم کی تربیت دی جائے۔

(۱۰) آئندہ اساتذہ کی تربیت کی تمام مراحل میں بشمول بی ایڈ وایم ایڈ اسلامیات کی معیاری اور ٹھوس تعلیم و تربیت کو لازمی کیا جائے۔

(۱۱) جب تک کسی درس گاہ میں اسلامیات کے تربیت یافتہ اساتذہ موجود نہ ہوں اس وقت تک اسے منظور نہ یہ جائے۔

(۱۲) درس گاہوں کے ماحول کو اسلامی بنانے کے لئے ہر مضمون میں ایسے اساتذہ کا انتخاب کیا جائے جو نظریہ پاکستان یعنی اسلام سے محبت و عقیدت رکھتے ہوں۔ نیز اسلامیات کی تعلیم کے لئے صرف وہ اساتذہ منتخب کئے جائیں جو اپنی ظاہری عملی زندگی میں اسلامی تعلیمات کے پابند ہوں۔

(۱۳) مخلوط تعلیم کو بلا تاخیر فوراً ختم کیا جائے۔

(۱۴) طلباء کو غیر نصابی سرگرمیوں میں ایسی سرگرمیوں کی اجازت نہ دی جائے جو اسلام کے خلاف ہو۔ مثلاً رقص و سرود اور ڈرامے وغیرہ۔

(۱۵) پورے پاکستان کے طلباء کے لئے پاکستان کی قومی لباس کا یونیفارم مقرر کیا جائے۔

(۱۶) درسگاہوں میں اسلامی شعائر کا پورا احترام کیا جائے۔ نمازوں کے اوقات میں نماز کے وقفے دیئے جائیں اور ہر درس گاہ میں نماز کے لئے جگہ مخصوص کرنا لازمی قرار دیا جائے۔

(۱۷) ہفتہ وار تعطیل اتوار کے بجائے جمعہ کو کی جائے۔

(۱۸) دینی مدارس کو منظم کرنے کے لئے ایک آزاد اور خود مختار بورڈ بنایا جائے جو دینی مدارس کے ذمہ دار علمائے دین پر مشتمل ہو اس میں دو جدید تعلیم کے ماہرین کو بھی شریک کیا جائے۔

(۱۹) ہر وہ دینی مدرسہ جو اس بورڈ سے ملحق ہونا پسند کرے اس کی اسناد کو منظور کیا جائے اور جو دینی مدارس اس کے ساتھ ملحق نہ ہوں ان کی اسناد حسب سابق غیر منظور شدہ رکھی جائیں۔

(۲۰) جو مدارس بورڈ کے ساتھ الحاق کریں وہ اپنے یہاں انٹرمیڈیٹ کلاس تک کا ایک اسکول قائم کریں اس مرحلہ تک جدید و قدیم تعلیم کا فرق ختم ہو جائے اور دینی مدارس کے مخصوص نصاب میں

وہی طلباء داخل ہوں جو امنیٹری کلاس سے فارغ ہو چکے ہوں۔

(۲۱) آگے دینی مدارس کے مخصوص نصاب کو چار مراحل پر تقسیم کیا جائے۔ علوم ابتدائیہ، علوم ثانویہ، علوم عالیہ اور تخصص۔ بورڈ اپنی صوابدید پر اس میں معاشیات، سیاسیات، اور جدید فلسفہ کا اضافہ کر سکتا ہے۔

(۲۲) یہ بورڈ کسی ہیئت حاکمہ کا پابند نہ ہو بلکہ جملہ تعلیمی امور میں خود مختار ہو، وہی نصاب وضع کرے اور وہی امتحانات لے کر اسناد دے۔

(۲۳) دینی مدارس یا بورڈ کو حکومت کی طرف سے مالی امداد نہ دی جائے۔ بلکہ وہ حسب سابق عوامی تعاون کی بنیاد پر چلتے رہیں۔

(۲۴) اس بورڈ کی دی ہوئی اسناد کو تسلیم کیا جائے اور علوم ابتدائیہ کو میٹرک، علوم ثانویہ کو انٹر، علوم عالیہ کو گریجویشن، تخصص کو ایم اے کے مساوی قرار دیا جائے۔

(۲۵) ادیب عالم اور فاضل کے امتحانات کا نظم ختم کر دیا جائے۔

(۲۶) پاکستانی باشندوں کی قائم کئے ہوئے مشنری اسکولوں کو صرف غیر مسلموں کے لئے مخصوص کر دیا جائے۔ مسلمان طلباء کو اس میں داخلہ کی اجازت نہ دی جائے۔

(۲۷) تعلیم بالغان کے نصاب میں ناظرہ قرآن کریم ضروی اسلامیات کو شامل کیا جائے۔

(۲۸) جہاں تک ممکن ہو تعلیم بالغان کا مرکز مساجد کو بنایا جائے۔

(۲۹) عورتوں کے لئے تعلیم کا بالکل الگ نصاب اور نظام بنایا جائے اور مخلوط طریقہ تعلیم کو یکسر ختم کر دیا جائے۔

(۳۰) مندرجہ ذیل امور کے لئے صرف مستند علمائے دین کا انتخاب کیا جائے جن کے علم وفضل پر قوم اعتماد کرتی ہو۔

الف:۔ تمام مراحل تعلیم کے لئے اسلامیات کی نصاب کمیٹی۔

ب:۔ معارف اسلامیہ کی فیکلٹی کے تمام شعبے۔

ج:۔ اسلامیات کی نصابی کتب کی تصنیف وتدوین۔

د:۔ سنڈیکیٹ (معارف اسلامیہ کی فیکلٹی کا ڈین) اس میں شامل ہونا چاہئے۔

ذریعہ تعلیم

زیر تبصرہ پالیسی میں انگریزی کو بحیثیت ذریعہ تعلیم ختم کر کے قومی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کی جو سفارش کی گئی ہے وہ قوم کی تمناؤں کے عین مطابق ہے۔ ہم اس سفارش کی پرزور تائید وتصویب

کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ ذریعہ تعلیم کو ایک آزاد اور نظریاتی قوم کے لئے بائیس سال کے عرصہ میں ہمارے پست معیار تعلیم کے اسباب میں سے ایک اہم سبب انگریزی تھا۔ پالیسی میں بالکل صحیح کہا گیا ہے کہ مغربی نظام تعلیم رائج کرنے سے انگریزوں کا مقصد مسلمانوں کو علم وفن کی اعلیٰ تعلیم دینا نہ تھا بلکہ ہندوستانی انگریز پیدا کرنا تھا جو انگریزی زبان جانتے اور سمجھتے ہوں۔ لہٰذا یہ اقدام قابل مبارک باد ہے۔ البتہ اصطلاحات اور اعداد کو بدستور انگریزی رکھنے کے سلسلے میں ان اداروں سے مشورہ کرنا چاہئے۔ جنھوں نے ان کا اردو ترجمہ کرنے کی خدمات انجام دی ہیں۔

ضمیمہ تجاویز

متعلقہ معیار تعلیم اسلامیات

معیار نصاب

ہماری رائے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لئے نصاب کا معیار تجویز کرتے وقت مندرجہ ذیل تین اصولوں کو بنیاد بنانا چاہیے۔

۱۔ ہر جماعت کا نصاب اس دینی ضرورت کو کماحقہ پورا کرتا ہو جو عمر کے اس مرحلے میں ایک مسلمان کو پیش آتی ہیں۔

۲۔ نصاب اتنا زیادہ بھی نہ ہو کہ وہ تمام مضامین کی مطلوبہ استعداد پیدا کرنے میں رکاوٹ بن جائے۔

۳۔ اتنا دقیق بھی نہ ہو کہ ذہن کے لئے ایک بار ثابت ہو۔

ان ہی تین بنیادوں پر ہم نصاب تعلیم وضع کرنے کے لئے طویل عرصہ سے غور وفکر اور مختلف تجربات کرتے رہے ہیں۔ تجربے کے لئے کئی مدارس عربیہ میں ایسے اسکول بھی قائم کئے گئے ہیں جن میں پورے سرکاری نصاب کے ساتھ مناسب حد تک دینی تعلیم کو سمویا گیا ہے۔ زیر غور تعلیمی پالیسی نے ہمیں پچھلے کئی سال کی کوششوں اور غور وفکر کے نتائج پر دوبارہ سوچنے اور مشاورت کا بہترین موقع فراہم کر دیا۔ اس موقع پر ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ معیار بھی تجویز کر دیں جو دینی تعلیم کے لئے نئی تعلیمی پالیسی کا جزو بننا چاہیے۔

ہم طویل غور وفکر اور جدید، قدیم ماہرین تعلیم کے مشوروں اور اپنے قائم کردہ اسکولوں کے تجربات کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ موجودہ سرکاری نصابکی پوری تعلیم کے ساتھ بچے پانچویں جماعت تک دینی تعلیم کا وہ معیار بآسانی حاصل کر لیتے ہیں جو ہم اگلی سطور میں بیان کریں گے اس اضافے سے نہ توان کی صحت پر برے اثرات کا مشاہدہ ہوا اور نہ دیگر مضامین میں ان کی استعداد پر کسی بھی پہلو سے کمزوری کے آثار رونما ہوئے۔ بلکہ یہ حقیقت کھل کر سامنے آئی کہ ان اسکولوں کے طلباء کا معیار دینی تعلیم کے علاوہ دیگر مضامین میں بھی عام اسکولوں سے بدرجہا بہتر رہا۔ لہٰذا ہم پانچویں جماعت تک دینی تعلیم کے لئے مندرجہ ذیل معیار تجویز کرتے ہیں۔

۱۔ قرآن کریم:

الف۔ پانچویں جماعت تک قرآن کریم ناظرہ کامل (صحیح تلفظ کے ساتھ)

ب۔ پارہ عم کا نصف آخر حفظ (صحیح تلفظ کے ساتھ)

اسلامیات: (بذریعہ قومی زبان)

اس مضمون میں مندرجہ ذیل عنوانات کی تفصیل اس انداز پر آجانی چاہئے کہ ہر جماعت میں تدریجاً اس کا معیار بلند ہوتا چلا جائے۔

الف عقائد (ب) عبادات (ج) اخلاق و آداب (د) سیرت طیبہ

دینی تعلیم کے مذکورہ دونوں مضامین یعنی قرآن کریم اور اسلامیات کا جماعت وار معیار تعلیم اور اوقات کی تفصیل سلیبس میں بیان کر دی گئی ہے جو آئندہ صفحات میں شامل ہے۔

اسلامیات اور قرآن کریم کی الگ الگ مستقل حیثیت:

البتہ یہ بات نہایت ضروری ہے کہ آئندہ قرآن کریم اور اسلامیات کو الگ الگ مضمون قرار دیا جائے۔ جبکہ موجودہ نظام تعلیم میں دونوں کو ملا کر ایک قرار دیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ دونوں مضمون اگرچہ بظاہر لازمی ہیں مگر عملاً اختیاری ہو کر رہ گئے ہیں کیوں کہ امتحانات میں قرآن کریم کے کل نمبر تیس اور اسلامیات کے بیس رکھے گئے ہیں. اب اگر کوئی بچہ قرآن کریم بالکل نہ پڑھے یا اس میں ایک نمبر بھی حاصل نہ کر سکے اور اسلامیات میں ۲۰ میں سے ۱۷ نمبر حاصل کرے تو وہ کامیاب تصور کیا جائے گا۔ ہماری رائے میں ایسا ہرگز نہ ہونا چاہئے۔ ورنہ دونوں مضامین کی اہمیت بالکل ختم ہو کر رہ جائے گی۔

اس لئے ضروری ہے کہ ان دونوں چیزوں کو الگ الگ لازمی مضمون کی حیثیت دی جائے اور ان میں سے طالب علم اگر ایک میں بھی فیل ہو جائے تو اسے اگلی جماعت میں ترقی پانے سے اسی طرح روک دیا جائے جس طرح موجودہ نصاب و نظام تعلیم میں اردو. حساب اور انگریزی میں ناکامی کی صورت میں کیا جاتا ہے۔

وقت تعلیم:

دینی تعلیم کے مذکورہ معیار کو واقعی اور موثر انداز میں نصاب کا لازمی جزو بنانے کے لئے ضروری ہو گا کہ اسکولوں کے موجودہ تعلیم کے وقت میں دو تبدیلیاں کی جائیں۔

ا۔ وقت تعلیم میں اضافہ۔

ہم طویل غور و فکر اور عربی مدارس کے تحت چلنے والے پرائمری اسکولوں میں کئی سال تجربہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ پرائمری اسکولوں میں یومیہ وقت تعلیم ایسی جامد اور قطعی حیثیت نہیں رکھتا جس میں کسی قدر بھی کمی بیشی ممکن نہ ہو یا اس میں معمولی اضافے کو بچوں کا مزاج یا جسمانی صحت بآسانی برداشت نہ کر سکے۔ بلکہ ہمارے مشاہدے اور تجربے نے یہ بات واضح طور پر ثابت کر دی ہے کہ قرآن کریم اور اسلامیات کے سلسلے میں بڑھائے ہوئے وقت نے ایک طرف تو دینی تعلیم کو صحیح بنیادوں پر استوار کر دیا دوسری طرف طلباء کی صحت چستی اور دلچسپی بھی متاثر نہیں ہوئی نیز مضامین کی مطلوبہ استعداد میں بھی کمی کے بجائے اضافہ ہوا۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ بحالت موجودہ جبکہ دینی تعلیم کا قابل ذکر انتظام اسکولوں میں نہیں ہے ان میں تعلیم دلانے والے بیشتر والدین دوسرے وقت میں مزید دو تین گھنٹوں کے لئے اپنے بچوں کو مساجد اور مکتبوں میں بھیجتے ہیں۔ جہاں وہ قرآن کریم اور دینیات کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اگر پورے ملک کے پرائمری اسکولوں کا اس پہلو سے سروے کیا جائے تو بعید نہیں کہ ایسے ہی بچوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہو۔

لہٰذا ہماری تجویز یہ ہے کہ پرائمری اسکولوں کے کل تعلیمی وقت میں جماعت اول و دوم کے لئے ایک گھنٹہ یعنی ساٹھ منٹ یومیہ کا اضافہ اور جماعت سوم تا پنجم کے لئے پچاس منٹ یومیہ کا اضافہ اس طرح جماعت اول اور دوم کا روزانہ کل تعلیمی وقت ۵ گھنٹے (۱۰ پیریڈ) اور جماعت سوم تا پنجم کا روزانہ وقت ساڑھے پانچ گھنٹے ہو جائے گا۔

اسکولوں کے بچے بحالت موجودہ تعلیم قرآن کی خاطر دو تین گھنٹے مکاتب اور مساجد میں صرف کرتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اسکول ہی کے وقت میں دو تین گھنٹے کے بجائے صرف ایک گھنٹے کا اضافہ برداشت نہ کر سکیں۔

۲۔ بعض ایسے مضامین کا کچھ وقت دینی تعلیم کی خاطر لے لیا جائے جن میں استعداد کا مطلوبہ معیار کچھ وقت کم کر کے بھی بآسانی حاصل ہو سکتا ہے۔ مثلاً جسمانی تعلیم و صحت. معاشرتی علوم اور عملی فنون کا جو معیار پرائمری کے نصاب میں مقرر کیا گیا ہے اس کے لحاظ سے ان کے وقت میں اگر قدرے کمی کر دی جائے تو نصاب کی مطلوبہ استعداد پھر بھی بآسانی حاصل ہو جاتی ہے بلکہ ہمارے قائم کردہ اسکولوں میں حاصل ہوتی رہی ہے اور ان مضامین میں بچے بورڈ کے امتحان میں نہایت اچھے نمبر حاصل کرتے رہے ہیں۔

مذکورہ دونوں تجاویز کو اگر عملی جامہ پہنایا گیا تو قرآن کریم اور اسلامیات کو اتنا وقت دینا ممکن ہو جائے گا جو ان کے لئے ضروری ہے۔

نوٹ:۔ دینی تعلیم کے لئے وقت میں اضافے بطور بعض دیگر مضامین کے وقت میں قدرے ترمیم اسی نوعیت کی ہے جو "پاکستان کے ابتدائی مدارس کے نصاب ۱۹۶۱ء" کے صفحہ ۲۴ پیراگراف ۷ میں اختیاری طور پر انگریزی پڑھانے کے لئے تجویز کی گئی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ جو ترمیم کم سن بچوں کو انگریزی پڑھانے کے لئے کی جاسکتی ہے وہ دینی تعلیم کے لئے اختیار نہ کی جائے۔

ہم دستخط کنندگان ذیل اس رپورٹ کو تفصیل سے پڑھا اور سنا ہم اس سے بالکل متفق ہیں:۔

نام	عہدہ	درس گاہ
(۱) محمد شفیع	صدر مجلس	دارالعلوم۔ کراچی نمبر ۱۴
(۲) محمد یوسف بنوری	- - -	مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیو ٹاؤن، کراچی
(۳) محمد احمد تھانوی	مہتمم	مدرسہ اشرفیہ سکھر۔
(۴) محمد عمر بلوچ	مہتمم	مدرسہ اسلامیہ عربیہ احرار الاسلام کراچی
(۵) سید محمد یوسف	استاد عربی	جامعہ کراچی
(۶) اللہ ورایو بروہی	ناظم	مدرسہ مظہر العلوم۔ کھڈہ۔ کراچی
(۷) محمد مظہر بقا	لکچرر	جامعہ کراچی
(۸) محمد طاسین	مدیر مجلس علمی	مجلس علمی کراچی
(۹) بشیر احمد صدیقی	مدیر عائشہ باوانی کالج	عائشہ باوانی کالج کراچی
(۱۰) محمد رفیع عثمانی	ناظم مدرسہ ابتدائیہ واستاد حدیث	دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴
(۱۱) سبحان محمود	استاذ حدیث	دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴
(۱۲) محمد عاشق الٰہی	= = =	= = = =
(۱۳) محمد یوسف	مدیر ماہنامہ بینات	مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی
(۱۴) محمد تقی عثمانی	مدیر ماہنامہ البلاغ	دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴
(۱۵) سید حامد	ناظم تعلیمات ومدرس	مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیو ٹاؤن کراچی
(۱۶) ولی حسن ٹونکی	مدرس	مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی
(۱۷) رشید احمد عفی عنہ	- - -	اشرف المدارس، ناظم آباد کراچی
(۱۸) محمد عبدالرؤف	صدر مدرس	مدرسہ عربیہ مفتاح العلوم گھاس مارکیٹ حیدر آباد
(۱۹) مفتی شمس الدین	مہتمم	مدرسہ عربیہ مفتاح العلوم حیدر آباد
(۲۰) ظفر احمد عثمانی		ٹنڈوالہ یار

اس سے آگے سیلبس کا مجوزہ نقشہ منسلک کیا گیا تھا جسے بخوف طوالت یہاں حذف کیا جا رہا ہے. جن حضرات کو دلچسپی ہو وہ مکمل تعلیمی تجاویز دار العلوم سے طلب فرمائیں جو کتابی شکل میں شائع کر دی گئی ہیں۔

تعلیمی پالیسی (۲)

پچھلے مہینے پاکستان کے وزیر تعلیم جناب شمس الحق صاحب نے ایک پریس کانفرنس کے ذریعہ تعلیمی پالیسی کے بنیادی نکات کا اعلان کیا ہے۔ یہ اعلان نو مہینے کے طویل غور و خوض اور سرکاری سطح پر مشوروں کے مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد کیا گیا ہے۔ اور ہم یہ لکھتے ہوئے انتہائی کرب و اذیت محسوس کر رہے ہیں کہ اس اعلان نے اس قوم کو بری طرح مایوس کیا ہے۔ جس نے پچھلے سال جولائی میں حکومت کی نئی تعلیمی تجاویز کا مثالی جوش و خروش کے ساتھ استقبال کیا تھا۔ پاکستان کی تاریخ میں ایسے مواقع بہت کم آئے ہیں جن میں حکومت کی کسی پالیسی کو عوام نے اتنی گرم جوشی کے ساتھ سراہا ہو جتنی گرم جوشی کے ساتھ اس تعلیمی پالیسی کو سراہا گیا تھا۔ ملک کے تقریباً ہر طبقے، ہر مکتب فکر اور ہر حلقے نے اس پالیسی کو بنیادی طور پر خوش آئند قرار دے کر اس کی بڑھ چڑھ کر تائید کی تھی۔ اور غیر معمولی امنگ اور ولولے کے ساتھ اسے خوش آمدید کہا تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ خود سرکاری اعلان کے مطابق اس پالیسی سے متعلق مختلف حلقوں کی طرف سے، جو تجاویز حکومت کو وصول ہوئیں، وہ پندرہ ہزار صفحات پر مشتمل تھیں۔ جب کہ ۱۹۵۸ء کے تعلیمی کمیشن کو کل ۵۷ افراد نے اپنی تجاویز ارسال کی تھیں۔

لیکن نو مہینے کے بعد جب یہ پالیسی نافذ ہونے کے لئے سامنے آئی ہے تو ایک انقلابی پالیسی کی حیثیت سے اس کی کایا ہی پلٹ چکی ہے۔ جن لوگوں کے پیش نظر صرف تنخواہوں کے اسکیل اور اسی قسم کے بعض دیگر انتظامی امور کا مسئلہ تھا وہ تو اس اعلان سے یقیناً خوش ہوئے۔ اور بلاشبہ اس اعلان کا یہ پہلو روشن بھی ہے۔ لیکن جو لوگ اس بات کی آس لگائے بیٹھے تھے کہ اس پالیسی کے ذریعہ ملک میں قومی پیمانے پر کوئی بہتر نظام تعلیم قائم ہو سکے گا۔ اس اعلان سے ان لوگوں کی تمام آرزوئیں بجا طور پر خاک میں مل گئی ہیں۔

جولائی ۱۹۶۹ء میں ائیر مارشل نور خان کی طرف سے جو تعلیمی تجاویز شائع ہوئی تھیں۔ ان پر تبصرہ کرتے ہوئے جمادی الثانیہ ۱۳۸۹ء کے اداریے میں ہم نے لکھا تھا کہ :۔

حال ہی میں ائیر مارشل نور خاں صاحب ڈپٹی چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر پاکستان کی طرف سے جو نئی تعلیمی پالیسی شائع ہوئی ہے وہ بنیادی طور پر بڑی امید افزا اور قابل قدر ہے پاکستان کی بیس سالہ تاریخ میں شاید پہلا موقع ہے کہ تعلیم جیسے اہم اور بنیادی مسئلے پر ایک آزاد مسلمان قوم کی حیثیت سے غور و فکر کیا گیا ہے اور موجودہ نظام تعلیم کا حقیقت پسندی کے ساتھ جائزہ لے کر اس کو پاکستان کے مخصوص قومی حالات. ملی مزاج اور اس کی نظریاتی بنیادوں کی مطابق بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔" البلاغ ص ۳۲۳ ج ۳۔

یہ کیا خبر تھی کہ جس تعلیمی پالیسی کا ہم اتنے ذوق و شوق کے ساتھ استقبال کر رہے ہیں. نو مہینے کے بعد اس کا مرثیہ بھی لکھنا پڑے گا۔ لیکن نہ جانے ہماری بنیادی عملی پالیسیوں کی ترتیب پر کون حرماں نصیب افراد بیٹھے ہوئے ہیں جن کی قسمت میں عوام کی مذمت. تنقید احتجاج اور ایجی ٹیشن ہی لکھا ہوا ہے. اور اگر ان میں سے کچھ لوگ غلطی سے کوئی اچھا اقدام کر بھی بیٹھتے ہیں۔ جس پر عوام تعریف و تحسین کے پھول نچھاور کر سکتے ہوں تو یہ دوسرے لوگ اسے ایسا بگاڑ کر چھوڑتے ہیں کہ بالآخر مذمت کے سوا کچھ ہاتھ نہ آسکے۔

ابھی تک نامعلوم کن اسباب کی بناء پر اس ترمیم شدہ ـــــ بلکہ تحریف شدہ تعلیمی پالیسی کا مکمل متن منظر عام پر نہیں آیا. صرف وہ بنیادی نکات ہی معلوم ہوسکے ہیں جو وزیر تعلیم نے اپنی پریس کانفرنس میں بیان کئے ہیں. اس لئے ہم یہاں صرف ان ہی نکات پر تبصرہ کر سکتے ہیں۔

اس نئی پالیسی کا سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس میں سے وہ بیشتر خوبیاں خذف کر دی گئی ہیں جو نور خاں صاحب کی پیش کی ہوئی پالیسی میں پائی جاتی تھیں۔ ائیر مارشل نور خان کی پالیسی نے ملک کے پورے نظام تعلیم میں ایسی انقلابی تبدیلیاں تجویز کی تھیں جن کی ذریعہ یہاں کا تعلیمی نظام ہمارے مخصوص قومی حالات. ملی مزاج اور ملک کی نظریاتی بنیادوں کے مطابق بنایا جاسکے۔ چنانچہ اس پالیسی میں پیش نظریات صرف اتنی نہیں تھی کہ "مذہبی تعلیم کا نصاب" بہتر بنایا جائے بلکہ پورے نظام تعلیم کو ایسے اسلامی سانچہ میں ڈھالنا تھا کہ ہر علم و فن کی تعلیم میں اسلامی طرز فکر. اور اسلامی ذہنیت رچی بسی ہوئی ہو اور اس کو پڑھ کر مسلمان سائنس داں. مسلمان انجینئر. مسلمان ڈاکٹر. مسلمان ماہرین معاشیات پیدا ہوسکیں لیکن ترمیم و تحریف کے بعد جو پالیسی سامنے آئی ہے اس میں پورے نظام تعلیم کو اسلامی بنانے کی بجائے صرف "مذہبی تعلیم کے نصاب کو بہتر بنانے" کی خواہش ظاہر کی گئی ہے اور اس غرض کے لئے ایک بورڈ بنا دیا گیا ہے۔ "مذہبی تعلیم" کی ترقی کے لئے جو خوبصورت الفاظ اس پالیسی میں استعمال کئے گئے ہیں. وہ کسی بھی طرح اس رپورٹ کے الفاظ سے زیادہ نہیں ہیں جو سابق صدر, محمد

ایوب خان صاحب کے زمانے میں قومی تعلیمی کمیشن نے ۱۹۵۸ء میں پیش کئے تھے۔ جو بات اس رپورٹ میں پانچ صفحات میں کہی گئی تھی[1] تقریباً وہی بات اس پالیسی میں چند فقروں کے اندر دہرادی گئی ہے سوال یہ ہے کہ اگر پوری قوم کو پھر بے حس کی اسی منزل پر لے جانا تھا جہاں وہ ۱۹۵۸ء میں پہنچی تھی تو یہ اتنا طول طویل ڈرامہ کھیلنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

جب جولائی ۱۹۶۹ء میں ائیر مارشل نور خاں کی تعلیمی تجاویز منظر عام پر آئیں تو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب صدر دارالعلوم کراچی اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری مہتمم مدرسہ عربیہ نیو ٹاؤن کراچی نے علماء کرام اور جدید تعلیم کا تجربہ رکھنے والے بیس افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی تھی جس نے ایک ہفتہ کے طویل غور و فکر کے بعد اس پالیسی کا خیر مقدم کرتے ہوئے تقریباً تیس صفحات پر مشتمل ایک مفصل یادداشت مرتب کی تھی[2] ۔ بعد میں مشرقی پاکستان کے چھپن مقتدر علماء کرام کی ایک مجلس میں (جس میں وہاں کے تمام ممتاز دینی درس گاہوں کے سربراہ شامل تھے) حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب اور حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب کی سفارشات کو زیر غور لایا گیا. اور متفقہ طور پر اسے منظور کرتے ہوئے ایک قرارداد مرتب کی گئی. مرکزی جمعیت علماء اسلام کی مجلس شوریٰ نے بھی جس میں مغربی اور مشرقی پاکستان کے چالیس سے زیادہ مقتدر علماء شامل تھے ان تجاویز کی مکمل تائید و حمایت کی[3] یہ تمام تجاویز مقررہ وقت کے اندر حکومت کو بھیج دی گئی تھی. اور ملک کے مختلف دوسرے حلقوں نے بھی ان کی تائید و تصویب کر کے تعلیمی پالیسی کو ان کی روشنی میں مرتب کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔

ان سفارشات میں یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دی گئی تھی کہ "مذہبی تعلیم کو معیاری بنانے" اور پورے نظام تعلیم کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے" میں کیا فرق ہے؟ ہماری قومی ضروریات کے لئے یہ دونوں کام یکساں طور پر لازمی اور ضروری ہیں۔ اور محض ایک گھنٹے میں اسلامیات کے چند مبہم اسباق پڑھا دینے سے قیامت تک وہ قوم پیدا نہیں ہو سکتی جو ایک آزاد اسلامی ریاست کے حقیقی تقاضوں کو پورا کر سکے. بلکہ اس کے لئے اپنی تعلیم کے پورے نظام اور نصاب میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے. ایسی انقلابی تبدیلیوں کی جو ہمارے نظام تعلیم کو اس مہلک اور جان لیوا زہر سے پاک کر سکے جو لارڈ میکالے نے پوری قوم کو انگریزوں کا غلام بنانے کے لئے اس میں سمویا تھا۔

---

[1] ملاحظہ ہو قومی تعلیمی کمیشن کی رپورٹ شائع کردہ وزارت تعلیم. جنوری۔ اگست ۱۹۵۹ء صفحہ ۳۲۹ تا ۳۳۳

[2] یہ پوری یادداشت ماہنامہ البلاغ کے جمادی الثانیہ ۱۳۸۹ھ کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے

[3] یہ دونوں قراردادیں بھی البلاغ کے رجب ۸۹ھ کے شمارے میں شائع ہوئی تھیں۔

ہماری سب سے بڑی شامت اعمال یہ ہے کہ جب ہم اپنے معاشرے کی بگاڑ کی اصلاح کے لئے اٹھتے ہیں تو بگاڑ کی اصلی جڑ کی طرف دیکھنے اور اسے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کے بجائے محض چند اوپری دواؤں سے اس کا سرسری علاج کرنا چاہتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ زندگی کے مختلف گوشوں میں اصلاحات کے سینکڑوں کمیشن قومی دولت کا کروڑوں روپیہ صرف کرنے کے بعد جوں کے توں اٹھ جاتے ہیں، اور ہر کمیشن معاشرے کے لئے کچھ نئے مسائل کھڑے کر دیتا ہے. چنانچہ جس رفتار سے ان "کمیشنوں" کی تعداد بڑھتی ہے، اس سے کہیں زیادہ رفتار سے بگاڑ کی جزئیات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

تعلیم کے مسئلے پر غور کرتے وقت اصل دیکھنے کی بات یہ تھی کہ تعلیم کا جو نظام اس وقت ہم نے اپنے اوپر لاد رکھا ہے، وہ کس نے کب اور کیوں ہمارے ملک میں رائج کیا تھا؟ جو مقاصد اس نظام کے بانی کے تھے، اگر وہی مقاصد آپ کے بھی پیش نظر ہیں تو سبحان اللہ! اسی نظام کو بنیادی طور پر برقرار رکھتے ہوئے جزوی اصلاحات کا طریقہ اختیار کرتے رہئے، لیکن گر اس نظام تعلیم کو رائج کرنے والے کے مقاصد آپ کے مقاصد سے مختلف تھے، اور جس قسم کی نسل وہ تیار کرنا چاہتا تھا، آپ اس کے بجائے کسی اور قسم کی قوم پیدا کرنا چاہتے ہیں، تو پھر اس طرز عمل کا آخر کیا جواز ہے کہ تعلیمی نظام کی ساری مشینری سر سے لے کر پاؤں تک آپ وہی رکھتے ہیں جو میکالے نے سرکاری ملازم یا زیادہ صحیح لفظوں میں اپنے ذہنی غلام پیدا کرنے کے لئے بنائی تھی، لیکن اس میں بس ایک "مذہبی تعلیم" کا چھوٹا سا پرزہ فٹ کر کے یہ چاہتے ہیں کہ اس سے ایک آزاد مسلمان قوم پیدا ہو جو نوکری کے بجائے دنیا کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے اور جب وہ پرزہ اس انمل بے جوڑ مشین میں فٹ نہیں ہوتا تو اسے گھس گھس کر اس کی شکل وصورت ہی بگاڑ ڈالتے ہیں۔ آپ کے سارے کمیشن اور سارے مشاورتی بورڈ اس سوچ میں توانائیاں صرف کر رہے ہیں کہ اس پرزے کو کیسے گھسا جائے کہ وہ مشین میں ٹھیک ٹھیک جڑ سکے حالاں کہ اگر آپ وہ چیز پیدا نہیں کرنا چاہتے جس کے لئے یہ مشین بنائی گئی تھی تو اس کے لئے چند پرزوں کو نہیں، پوری مشین کو بدلنا پڑے گا۔ اور جب تک یہ انقلابی قدم نہیں اٹھایا جائے گا، آزادی فکر و عمل کی وہ منزل کبھی قریب نہیں آسکے گی جس کے لئے پاکستان بنایا گیا تھا۔

موجودہ نظام تعلیم کا بانی لارڈ میکالے تھا، اور اس نے اپنی جو تاریخی یادداشت ۱۸۵۳ء میں مقبوضہ ہندوستان کے گورنر جنرل کو پیش کی تھی، اسمیں اس نظام تعلیم کے تمام مقاصد پوری صفائی بلکہ ڈھٹائی سے کھول کھول کر بیان کر دیئے گئے تھے، اس کا سب سے بڑا مشن یہ تھا کہ ہندوستان کے باشندوں، بالخصوص، مسلمانوں کو اپنے سارے تہذیبی ورثے کے بارے میں شدید احساس کمتری کا شکار

بنا کر ان کے دلوں پر مغرب کی ہمہ گیر بالادستی کا سکہ بٹھا دیا جائے. اور نئی نسل کو ہر ممکن طریقے سے یہ یقین کر لینے پر مجبور کر دیا جائے کہ اگر دنیا میں ترقی اور سربلندی چاہتے ہو تو اپنی فکر اپنے فلسفے. اپنی تہذیب. اپنی معاشرت اور اپنے سارے ماضی پر ایک حقارت بھری نظر ڈال کر مغرب کے پیچھے پیچھے چلے آؤ اور اپنی زندگی کا ہر راستہ اسی کے نقوش قدم میں تلاش کرو۔

لارڈ میکالے کے مندرجہ ذیل الفاظ بطور خاص غور سے پڑھیے:۔

"مجھے نہ تو عربی سے کوئی واقفیت ہے نہ سنسکرت سے مگر ان کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لئے میں جو کچھ کر سکتا تھا اس میں کوئی کسر میں نے اٹھا نہیں رکھی.......... میں اس بات پر بھی تیار ہوں کہ مستشرقین جو اہمیت ان علوم کو دیتے ہیں وہی میں بھی دوں۔ ان حضرات میں مجھے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ملا جو اس حقیقت سے انکار کرے کہ یورپ کے کسی اچھے کتب خانہ کی محض ایک الماری ہندوستان اور عرب کے سارے ادبی سرمایہ پر بھاری ہے۔"

(میکالے کا نظریہ تعلیم، مترجمہ عبدالحمید صدیقی۔ ص: ۴۷، ۸۴ مطبوعہ روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی، کراچی)

آگے لکھتا ہے:۔

میری آج تک کسی ایسے مستشرق سے ملاقات نہیں ہوئی جو اس بات کا دعویدار ہو کہ عربی اور سنسکرت شاعری کو یورپین شاعری کے مقابلہ میں کھڑا کیا جا سکتا ہے. لیکن جب ہم ان تخلیقات کے دائرہ سے باہر نکل کر جن کا محور محض تخیل ہے. ان علوم کی طرف نگاہ دوڑاتے ہیں جو حقائق پر مبنی ہیں، جن میں تجربہ و مشاہدہ بطور اساس کام کرتے ہیں تو اس وقت یورپ کی فضیلت مسلم ہو جاتی۔" (صفحہ ۵۰)

ایک صفحے کے بعد لکھتا ہے:

"اب حل طلب مسئلہ صرف یہ رہ جاتا ہے کہ جب ہمیں ایک زبان کی تعلیم دینے کا اختیار حاصل ہے تو کیا پھر بھی ہم ان زبانوں کی تعلیم دیں گے جن میں مسلمہ طور پر کسی موضوع سے متعلق بھی کوئی ایسی قابل قدر کتاب نہیں ملتی جسے ہماری زبان کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہو؟ جب ہم یورپین علوم پڑھانے کے معاملے میں بالکل آزاد ہیں تو کیا پھر بھی ہم ان علوم کی تعلیم دیں گے جو یورپین علوم سے جہاں کہیں مختلف ہیں وہاں ان کی لغویت مسلمہ طور پر نمایاں ہے۔

جب ہم ایک صحیح فلسفہ اور تاریخ کی سرپرستی رکھنے کی قدرت رکھتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ہم سرکاری دولت کے صرف سے وہ طبی اصول پڑھائیں جن کو دیکھ کر انگلستان کا نعل بند بھی خفت محسوس کرتا ہے. وہ علم ہیئت جس پر انگریزی اسکولوں کی بچیاں بھی خندہ زن ہوں گی. وہ علم تاریخ جو تیس تیس فٹ لمبے قد کے بادشاہوں کے تذکرے سے بھرا پڑا ہے. جنھوں نے تیس تیس ہزار سال تک حکمرانی اور فرمانروائی کی. وہ جغرافیہ جو شیرے. راب اور مکھن کے سمندروں کے بیانات پر مشتمل ہے[1] " (صفحہ ۵۲ تا ۵۴)

آگے لکھتا ہے:

"اس بات پر بہت اصرار کیا گیا ہے کہ ہندو قانون تو سنسکرت کی کتابوں سے اور محمڈن لاء عربی کتابوں ہی سے اخذ کرنا ہو گا۔ لیکن یہ معاملہ مسئلہ زیر بحث پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ ہمیں پارلیمینٹ نے اس بات کا حکم دیا ہے کہ ہم ہندوستان کے لئے قوانین مرتب کریں۔ اس مقصد کے لئے ہمیں لاکمیشن کی امداد بھی بہم پہنچائی گئی ہے. جس وقت نیا ضابطہ قانون نافذ ہو گا. اس وقت منصفوں اور صدر امینوں کے لئے شاستر اور ہدایہ بالکل بیکار ہو جائیں گی. مجھے امید واثق ہے کہ وہ طلباء جنھوں نے اب عربی مدارس اور سنسکرت کالجوں میں داخلہ لیا ہے. ان کے تعلیم سے فارغ ہونے سے پیشتر. یہ عظیم کام پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہو گا۔ ہمارا یہ فعل بدیہی طور پر احمقانہ ہو گا کہ ہم نئی نسل کو ان حالات کے پیش نظر تعلیم دیں جنھیں ان کے جوان ہونے سے پہلے ہم بدل دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔" (صفحہ ۶۵)

عربی زبان کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

"عربی اور سنسکرت کے حق میں ایک اور دلیل جو اس سے بھی کہیں زیادہ کمزور اور بودی ہے. یہ دی جاتی ہے کہ ان زبانوں میں چونکہ کروڑوں انسانوں کی مقدس کتابیں موجود ہیں اس بناء پر یہ خصوصی امداد کی مستحق ہیں. سرکار انگریزی کا بلاشبہ یہ فرض ہے کہ وہ ہندوستان کے مذہبی معاملات میں نہ صرف روادار ہو بلکہ غیر جانب دا

---

[1] جیسا کہ میکالے نے خود بیان کیا ہے. وہ عربی اور سنسکرت سے (دونوں سے) بالکل نابلد تھا یہی وجہ ہے کہ وہ غالباً "طلسم ہوشربا" کو تمام مشرقی علوم کی نمائندہ کتاب سمجھ کر اس کی ساری باتوں کو مشرقی علم طب. علم فلسفہ. علم تاریخ. اور علم جغرافیہ کے سر منڈھ رہا ہے۔

بھی ہو۔ مگر کسی ایسے ادب کی جو مسلمہ طور پر بہت کم قدر و قیمت کا حامل ہے. محض اس وجہ سے حوصلہ افزائی کرتے چلے جانا کہ اس میں بعض اہم موضوعات پر انتہائی غلط باتیں موجود ہیں۔ میرے نزدیک یہ ایک ایسی روش ہے جس کی تائید نہ تو عقل کرتی ہے نہ اخلاق اور نہ وہ غیر جانب داری جس کا قائم رکھنا ہم سب کا مقدس فرض ہے۔ ایک ایسی زبان جس کے بارے میں ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ اس کا دامن ہر قسم کی مفید معلومات سے خالی ہے. کیا اس کے پڑھانے کا اس لئے التزام کیا جائے کہ وہ ہیبت ناک اوہام کو جنم دیتی ہے؟ کیا ہم جھوٹی تاریخ. غلط علم ہیئت اور غلط تاریخ محض اس لئے پڑھائیں کہ ان سے ایک باطل مذہب کی تائید ہوتی ہے؟

ہم اس بات سے بہت زیادہ احتراز کرتے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے کہ ان مسیحی مشنریوں کی سرکاری طور پر پشت پناہی کی جائے جو اہل ملک کو عیسائی بنانے میں مصروف ہیں[1]. جب عیسائیت کے بارے میں ہمارا طرز عمل یہ ہے تو کیا یہ مناسب ہو گا کہ ہم حکومت کے خزانے سے رشوت دے کر لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ اپنی نئی نسل کو اس قسم کی تعلیم دلوائیں جس کے ذریعہ انسان یہ جان سکے کہ گدھے کو چھونے کے بعد آدمی کس طرح پاک ہو سکتا ہے۔ یا وید کے کن اشلوکوں سے بکرا مار دینے کا کفارہ ادا کیا جا سکتا ہے۔ (صفحہ ۶۶ و ۶۷)

ربی مدارس سے شدید نفرت اور اس کے اسباب کا بیان اس طرح فرمایا جاتا ہے:۔

عربی اور سنسکرت کالجوں پر اس وقت جو کچھ خرچ ہو رہا ہے وہ نہ صرف صداقت کی حق تلفی ہے بلکہ سرکاری خزانے سے غلط کاروں کی پرورش کی جا رہی ہے. اس رقم سے ایسی پناہ گاہیں تعمیر ہو رہی ہیں جن میں نہ صرف مجبور بے بس بیروزگار پناہ لیتے ہیں. بلکہ ان کے اندر ایسے متعصب اور تعصبات اور مفادات کی بناء پر ہر نئی تعلیمی اسکیم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ (صفحہ ۶۳)

پھر اس رپوٹ کے آخر میں تعلیم بدلنے کی اصل غرض و غائیت کو نہایت واشگاف الفاظ میں اس طرح بیان کرتا ہے:

ہم فی الحال اپنے محدود ذرائع کے ساتھ سب لوگوں کے تعلیم کا بندبست نہیں

---

[1] کیوں کہ اگر مقصد مذکورہ بالا "غیر جانبدارانہ تعلیم" سے حاصل ہو جائے تو اس بکھیڑے میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟۔ مدیر

کر سکتے۔ ہمیں اس وقت بس ایک طبقہ پیدا کرنے کی سعی کرنی چاہیئے جو ہمارے اور ان کروڑوں انسانوں کے مابین ترجمانی کے فرائض سرانجام دے سکے جن پر ہم اس وقت حکمراں ہیں۔ ایک ایسا طبقہ جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو، مگر ذوق، طرز فکر، اخلاق اور فہم و فراست کے نقطۂ نظر سے انگریز۔ پھر اس کام کی ذمہ داری اس طبقے پر چھوڑ دیں کہ وہ اس ملک کی بولیوں کو سنوارے، مغربی علوم سے سائنسی اصلاحات لے کر ان زبانوں کو مالا مال کرے اور آہستہ آہستہ انہیں اس قابل بنائے کہ ان کے ذریعہ ملک کی آبادی کو تعلیم دی جا سکے۔ (صفحہ ۶۹)

ان اقتباسات سے یہ بات کسی بھی درجے میں ڈھکی چھپی نہیں رہ جاتی کہ اس نظام تعلیم کے ذریعہ انگریزوں کا مقصد کیا تھا؟ اور اس کے ذریعہ کس قسم کی نسل تیار کرنا چاہتے تھے؟ لارڈ میکالے کے یہ اقتباسات کسی تبصرے کے محتاج نہیں ہیں، میکالے نے اپنی اس رپورٹ میں علوم مشرق کے خلاف جس اندھے تعصب اور للہی بغض کا مظاہرہ کرتے ہوئے حقائق کو بری طرح مسخ کیا ہے، اس پر ہمیں کچھ کہنا نہیں، مشرق اور بالخصوص اسلام کے ساتھ یہ بغض تو انگریزوں کے خمیر میں شامل ہے، اور ایک موروثی روگ کی طرح اس بے چارے کو بھی ورثے میں ملا تھا، لیکن ہمیں کہنا صرف یہ ہے کہ ان اقتباسات میں یہ حقیقت صاف پڑھی جا سکتی ہے کہ اس نظام تعلیم کی بنیاد مشرق، مشرقی علوم، مشرقی مذاہب اور مشرقی تہذیب و معاشرت سے نفرت و عداوت پر رکھی گئی تھی، اور خود اس نظام کے بانیوں کی تصریح کے مطابق اس کا مقصد ایسے "کالے انگریز" پیدا کرنا تھا جو زندگی کے ہر شعبے میں مغرب کی اندھی تقلید کو اپنا شعار بنا کر زندگی کے آخری سانس تک انگریزوں کے غلام بنے رہیں، اور کبھی ان کی کسی "اسکیم پر صدائے احتجاج بلند نہ کر سکیں۔" چنانچہ اس نظام تعلیم کے رگ و ریشہ میں مشرق، مشرقی علوم اور مشرقی تہذیب سے نفرت کے تصورات بری طرح سمائے ہوئے ہیں، اور اس نظام تعلیم سے گذر کر جو ذہن تیار ہوتا ہے وہ مغرب کے مقرر کئے ہوئے دائروں سے باہر نکلنے کی مطلق جرائت نہیں رکھتا۔

لہٰذا مسئلہ صرف ایک گھنٹے میں "مذہبی تعلیم" دینے کا نہیں، بلکہ اس پورے نظام تعلیم کو یکسر بدلنے کا ہے، جس نے ہم سے ہماری قومی خودداری، ہماری ملی شعور اور ہمارے ماضی کا سارا تہذیبی اثاثہ چھین کر ہمیں تادم زیست مغرب کا غلام بنانے کی سازش کی تھی۔ . "یورپ کے کسی اچھے کتب خانے کی محض ایک الماری ہندوستان اور عرب کے سارے ادبی سرمایہ پر بھاری ہے ——— عربی زبان میں کسی موضوع سے متعلق بھی کوئی ایسی قابل قدر کتاب نہیں ملتی جسے انگریزی زبان کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہو ——— مشرقی علوم یورپین علوم سے جہاں کہیں مختلف ہیں وہاں ان لغویت مسلمہ طور پر

نمایاں ہے ــــ طب مشرق کے اصول دیکھ کر انگلستان کا نعل بند بھی خفت محسوس کرتا ہے ـــــ عربی زبان کا دامن ہر قسم کی مفید معلومات سے خالی ہے اور وہ ہیبت ناک اوہام کو جنم دیتی ہے۔ اور مشرق کی تاریخ اور فلسفہ جھوٹا ہے اور باطل مذاہب کی تائید کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے جس نظام تعلیم کی بنیاد ان تصورات پر اٹھائی گئی ہو اس میں صرف ایک "مذہبی تعلیم" کا تھوڑا سا اضافہ کر کے اس زہر کا بدرقہ کیسے کر سکتے ہیں جس کے اثرات ہر علم، ہر فن اور ہر نصاب میں غیر محسوس طور پر گھسے ہوئے ہیں؟

اس کے علاوہ انگریز کے ذہن میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی یہ بات نہیں رہی کہ ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں میں نئے علوم کے اعلیٰ درجے کے ماہرین پیدا کئے جائیں۔ یہ نظام صرف ایسے سرکاری ملازم پیدا کرنے کے لئے بنایا گیا تھا جو بقول میکالے ہمارے اور ان کروڑوں انسانوں کے مابین ترجمانی کے فرائض سرانجام دے سکے جس پر ہم حکمران ہیں۔ اسی لئے یہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کا معیار ہمیشہ سے انتہائی پست رکھا گیا ہے۔ لہٰذا اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے نظام تعلیم سے ایسے ...... افراد تیار ہوں جو کھلے ذہن کے ساتھ دنیا کا ہر مفید علم و فن حاصل کریں، مغرب کی اندھی تقلید کرنے کے بجائے ان علوم و فنون میں اجتہادی بصیرت پیدا کریں اور ذہنی غلامی کے بندھن توڑ کر اپنی زندگی کے راستے اسلامی اصولوں کی روشنی میں آپ متعین کریں تو آپ کو تمام جدید علوم کے نظام و نصاب کو از سر نو مدون کرنا ہو گا، اور ان تمام علوم سے مادہ پرستانہ تصورات کو نکال کر ان میں مسلمانوں کے افکار، مسلمان ذہنیت اور اسلامی طرز فکر کو سمونا پڑیگا[1] ۔ اس کے بغیر ایک آزاد مسلمان قوم کی تشکیل مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

یہ درست ہے کہ کام محنت طلب بھی ہے اور وقت طلب بھی، ہو سکتا ہے کہ اس نظام کو پوری طرح بدلنے میں سالہا سال لگ جائیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس انقلاب کے پورے ثمرات ہم اپنی زندگی میں نہ دیکھ سکیں، لیکن کسی قوم کی ذہنی تعمیر میں وقت لگنا ناگزیر ہے، لارڈ میکالے نے جو بیج ۱۸۵۳ء میں بویا تھا، وہ آج برگ و بار لایا ہے، ہم جو بیج بوئیں گے وہ شاید اکیسویں صدی میں پھل لے کر آئے، لیکن اگر محنت سے ڈر کر ہم نے یہ بیج آج بھی نہ بویا تو ہمارے صحن چمن میں ہمیشہ پھولوں کے بجائے جھاڑ جھنکار ہی اگتے رہیں گے، اور سو سال گذرنے پر بھی ہماری آزادی کا قافلہ اسی منزل پر کھڑا رہے گا جہاں وہ ۱۹۴۷ء میں پہنچا تھا۔

---

[1] اس کی مفصل تشریح البلاغ جمادی الثانیہ ۸۹ھ کے شمارے میں کی جاچکی ہے۔

ائیر مارشل نور خاں کی تعلیمی تجاویز نے یہ امید دلائی تھی کہ شاید اسلامی نظام تعلیم کا بیج بونے کی سعادت موجودہ حکومت کے حصے میں آجائے۔ لیکن اسلام دشمن طاقتیں تعلیم کے مسئلے کو ہم سے زیادہ اہمیت دیتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ کسی قوم کی تعمیر میں سب سے زیادہ موثر کردار اس کا نظام تعلیم ادا کرتا ہے اور اگر اس ملک میں کوئی صحیح نظام تعلیم اسلام کی بنیادوں پر استوار ہو گیا تو وہ ساری ناپاک امیدیں پیوند خاک ہو جائیں گی جو انہوں نے اس خطے سے وابستہ کی ہوئی ہیں۔ اس لئے نور خاں کی تعلیمی پالیسی کے منظر عام پر آتے ہی اسلام دشمن عناصر نے اندر ہی اندر اپنی ریشہ دوانیاں شروع کر دی تھیں۔ ظاہری سطح پر تو اس پالیسی کی مخالفت ...... ایک نہایت مختصر سے گروہ کی طرف سے ہوئی جسے کسی بھی درجے میں قابل اعتناء قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ورنہ قوم کے ہر طبقے اور ہر مکتب خیال نے بنیادی طور پر اس پالیسی کو اپنی امنگوں کا مظہر قرار دیا تھا۔ لیکن دشمنوں کی وہ گہری سازشیں جو ظاہری سطح سے زیادہ اندر کی جانب تارپیڈو پھینکنے میں مہارت تامہ رکھتی ہیں۔ بالآخر اس امید کو لے ڈوبیں۔ اور اب تعلیم کے معاملے میں ہم وہیں کھڑے ہیں جہاں ۱۹۵۸ء میں تھے نور خاں رپورٹ کی تمام بنیادی خوبیاں اس پالیسی میں سے حذف ہو چکی ہیں نہ تعلیمی نظام کو اسلامی بنانے کا کوئی ذکر ہے۔ نہ جدید و قدیم نظام ہائے تعلیم کی خلیج دور کرنے کا کوئی تذکرہ ہے۔ نہ مشنری تعلیمی اداروں پر پابندی لگنے کا مسئلہ زیر بحث آیا ہے۔ نہ قومی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے پر کوئی قابل ذکر توجہ دی گئی ہے۔ نہ تعلیمی اداروں کی آزادی و خود مختاری کی جانب کوئی اقدام کیا گیا ہے۔ اساتذہ کی تنخواہیں ضرور بڑھا دی گئی ہیں۔ اور یہ بلاشبہ ایک اچھا اقدام ہے۔ لیکن کیا ہمارے پورے نظام تعلیم میں حل طلب مسئلہ صرف یہ ایک ہی تھا؟

افسوس ناک بات یہ ہے کہ پالیسی کا یہ اعلان ایک ایسے موقع پر ہوا ہے جب کہ ساری قوم کی توجہ ہونے والے انتخابات پر مرکوز ہے۔ اور اس پالیسی کے ساتھ ہی ساتھ انتخابات کے قانونی ڈھانچے کا بھی اعلان کیا گیا ہے۔ جس نے عوام کی بیشتر توجہ اپنی طرف کھینچ لی ہے۔ ادھر اب تک پالیسی کا مکمل متن بھی منظر عام پر نہیں آیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ پالیسی کے بارے میں عوام کی صحیح رائے کا اظہار بھی نہیں ہو سکا۔

بہر کیف! یہ پالیسی کسی قیمت پر پاکستان کے مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ نور خاں رپوٹ پیش کر کے اس کو قوم کی خواہشات کے بالکل خلاف عملاً منسوخ کر دینا اور معاملے میں ساری قوم کو چھوڑ کر صرف چند انتشار پسند افراد کے کھوکھلے نعروں سے متاثر ہو جانا ایک ایسا طرز عمل ہے جو طرح طرح کے شکوک دل میں پیدا کر رہا ہے۔ اور حکومت کو اس صورت حال کا سنجیدگی سے جائزہ لے کر اپنی پالیسی کو عوام کی جائز خواہشات کے مطابق مرتب کرنا چاہئے۔

ہمارے نزدیک ہماری قوم کی تعمیر میں تعلیم کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ ہمارا بگاڑ اصل میں ذہن کا بگاڑ ہے۔ اور جب تک اس بگاڑ کو ختم کر کے پورے ملک کے لئے ایک اہم آہنگ

اسلامی نظام تعلیم جاری نہیں کیا جاتا، اس وقت یہ ملک اختلافات، نزاع وجدال، سیاسی اکھڑ پچھاڑ اور باہمی کشاکش کا اکھاڑہ بنا رہے گا، اور یہاں قومی سطح پر یک جہتی کے ساتھ کوئی دیرپا اصلاحی کام نہیں کیا جاسکے گا۔ لہٰذا ہماری سیاسی جماعتوں، دانشوروں اور علماء کرام کا یہ فرض ہے کہ وہ جتنی کوشش سیاسی نظام کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے کر رہے ہیں، اتنی ہی کوشش نظام تعلیم کی اصلاح کے لئے بھی کریں، اس لئے کہ ہماری حکومت صحیح اسلامی بنیادوں پر ٹھیک اسی وقت استوار ہو سکے گی جب نئی نسل کی ایک کھیپ اسلامی نظام تعلیم سے گذر کر حکومت سنبھالنے کے لئے تیار ہو چکی ہو۔

ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے سیاست داں، ارباب فکر اور علماء تعلیم کے مسئلے کو وہ اہمیت نہیں دے رہے جس کا وہ مستحق ہے، اور جتنی اہمیت اس کو اسلام دشمن عناصر کے یہاں حاصل ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت لادینی قوتوں کو بھی سیاسی سطح پر ایک شدید معرکے کا سامنا ہے، لیکن اس معرکے میں الجھ کر وہ تعلیمی پالیسی کو سبوتاژ کرنا نہیں بھولے، ہماری گزارش یہ ہے کہ جو قوتیں پاکستان میں اسلام کو سربلند دیکھنا چاہتی ہیں، ان کی ترجیحات (PRIORITIES) کی فہرست میں بھی تعلیم کا مسئلہ نیچے نہیں، بالکل اوپر ہونا چاہئے اور اس نازک وقت میں بھی ان کی توانائیوں کا بڑا حصہ نظام تعلیم کی اصلاح کے لئے وقف ہونا چاہئے۔

اس نئی تعلیمی پالیسی میں ایک اور چیز انتہائی مایوس کن اور خطرناک ہے، اور وہ پالیسی کے یہ الفاظ ہیں:

نصاب، ذریعہ تعلیم اور امتحانات کے لئے صوبائی حکومتیں قوانین مرتب کریں گی۔

(روزنامہ جنگ کراچی ۲۸ مارچ ۱۹۷۰ء)

جہاں تک امتحانات کے انتظام، طلباء کے داخلے، اساتذہ کی شرائط ملازمت اور دیگر انتظامی امور کا تعلق ہے، ان کو صوبائی حکومتوں پر چھوڑ دینا تو بالکل درست ہے لیکن نصاب اور ذریعہ تعلیم کے مسئلہ کو بھی صوبائی حکومتوں کے حوالے کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس ملک میں کبھی خالص قومی اور ملی سطح پر کوئی متحدہ نظام تعلیم وجود میں نہ آسکے۔ اور اس قوم کے مختلف صوبوں کے درمیان علمی سطح پر بھی کوئی ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا نہ ہو۔

اگر اس خطرناک طریقے پر ہر صوبے نے اپنا نصاب اور ذریعہ تعلیم جدا رکھا، اور تعلیم بھی قومی مسئلہ ہونے کے بجائے ایک صوبائی مسئلہ بن کر رہ گیا تو نظام تعلیم کی اصلاح کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی۔ اگر اس قوم کے افراد کو ایک متحدہ نصب العین پر جمع کر کے انہیں یک جہتی کے ساتھ پاکستان کی خدمت کے

لئے تیار کرنا ہے تو اس کا راستہ صرف یہ ہے کہ تمام صوبوں میں نصاب اور ذریعہ تعلیم یکساں ہو، اور اس کی تعین صوبوں کے بجائے قومی سطح پر کی جائے۔

اس پوری پالیسی میں نظام تعلیم کی اصلاح کے سلسلے میں امید کی اگر کوئی کرن نظر آتی ہے وہ "قومی تعلیمی کونسل" کا قیام ہے۔ پالیسی میں کہا گیا ہے کہ تعلیمی پالیسیوں اور پروگراموں کے لئے ایک قومی تعلیمی کونسل قائم کی جائے گی۔ اگرچہ نصاب اور ذریعہ تعلیم کا اختیار صوبوں کے حوالے کر کے اس کونسل کی افادیت کو نہایت محدود کر دیا گیا ہے، لیکن اگر یہ کونسل صحیح رجال کار پر مشتمل ہو اور انقلابی جذبے کے ساتھ کام کرے تو اس پالیسی کی غلطیوں کی تلافی کر سکتی ہے، اس لئے ہم اس بات کا پرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ:

(۱) یہ تعلیمی کونسل جلد از جلد قائم کی جائے۔

(۲) اس کونسل میں تمام ممتاز یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں اور ممتاز دینی مدارس کے سربراہوں کو شامل کیا جائے، جن کے علم و فضل، اسلام سے وابستگی اور پاکستان دوستی پر امت کو اعتماد ہے۔

(۳) اس کونسل کو اس بات کے اختیارات دیئے جائیں کہ وہ پورے ملک کے لئے قومی سطح پر اسلامی نظام تعلیم جاری کرنے کے لئے مفصل پالیسی وضع کرے اور اس کو روبہ عمل لائے۔

صرف یہ ایک طریقہ تو ایسا ہے جس کے ذریعہ ہمارے نظام تعلیم میں کسی حقیقی اصلاح کی امید کی جا سکے، ورنہ اس کے بغیر نئی پالیسی کے اس اعلان سے مسائل سلجھنے کے بجائے کچھ اور الجھ جائیں گے، اور نظام تعلیم سے متعلق جو عام بے چینی پائی جاتی ہے، اس میں کچھ اور اضافہ ہو جائے گا۔

حکومت کو چاہئے کہ وہ فوری طور سے اس صورت حال پر توجہ دے، اور قومی تعمیر کے اس اہم کام میں مظاہروں احتجاج اور جلسے جلوسوں کا انتظار کئے بغیر عوامی خواہشات کو سمجھ کر اس سمت میں فوری طور سے کوئی قدم اٹھائے۔ اب تک موجودہ حکومت کی طرف سے کوئی اقدام ایسا سامنے نہیں آیا جسے عوام کی اکثریت نے ناپسند کیا ہو، لیکن اگر مذکورہ غلطیوں کی تلافی نہ کی گئی اور قومی تعلیمی کونسل کے لئے رجال کار صحیح منتخب نہ ہو سکے تو اس پالیسی سے حکومت کا یہ ریکارڈ ٹوٹ جائے گا اور عوام اسے کسی قیمت پر قبول نہیں کریں گے۔

مذہبی تعلیم کا نصاب بنانے کے لئے جو بورڈ بنایا گیا ہے وہ بھی قرآن و سنت میں بصیرت رکھنے والے ہر مکتب فکر کے مستند علماء پر مشتمل ہونا چاہئے جن کے علم و فضل اور دین و دیانت پر امت اعتماد کرتی ہے، ظاہر ہے کہ دینی تعلیم کا صحیح نصاب وہی لوگ بنا سکتے ہیں جو دین کا صحیح علم اور دینی علوم کی تعلیم

وتدریس کا وسیع تجربہ رکھتے ہوں۔ اگر اس سامنے کی بات کو ہمیشہ کی طرح اس بار بھی نظر انداز کیا گیا تو اس بورڈ کا بھی وہی حشر ہو گا جو سابقہ حکومت کے قائم کئے ہوئے متعدد دینی ادروں کا ہو چکا ہے۔

ہم ان سطور کے ذریعہ حکومت تک عام مسلمانوں کی آواز پہنچا کر اپنا فرض ادا کر رہے ہیں، خدا کرے کہ ہمدردی اور دل سوزی سے نکلی ہوئی یہ آواز متعلقہ ذمہ داروں کو متاثر کر سکے۔

وماعلینا الاالبلاغ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

عالمی تعلیمی کانفرنس

پچھلے مہینے مکہ مکرمہ کی جامعۃ الملک عبدالعزیز نے مسلمانوں کی تعلیم کے موضوع پر ایک بین الاقوامی کانفرنس مکہ مکرمہ میں منعقد کی تھی۔ اس کانفرنس کا دعوت نامہ راقم الحروف کو تقریباً دس ماہ پہلے ہی موصول ہوگیا تھا، اور فرمائش کی گئی تھی کہ پاکستان میں روایتی تعلیم پر ایک مفصل رپورٹ مرتب کرے۔ احقر نے عربی زبان میں یہ رپورٹ مرتب کر کے کانفرنس سے چار مہینے پہلے بھیج دی تھی۔ (رپورٹ کا اردو ترجمہ البلاغ کے اس شمارے میں دوسری جگہ شائع ہو رہا ہے۔)

کانفرنس ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۹۷ھ بمطابق ۳۱ مارچ ۱۹۷۷ء سے مکہ مکرمہ میں شروع ہوئی مجھے حکومت پاکستان کی طرف سے ملک سے باہر جانے کی اجازت ملنے میں بڑی دقت بھی پیش آئی اور دیر بھی لگ گئی، اس لئے میں کانفرنس شروع ہونے کے دو روز بعد یہاں سے روانہ ہو سکا سعودی ایرلائنز کا طیارہ صبح ساڑھے دس بجے کے قریب روانہ ہوا اور دوبئی اور تہران ٹھہرتا ہوا جب جدہ ایرپورٹ پر اترا تو عصر کا حنفی وقت ہو چکا تھا۔ نماز عصر ادا کرنے کے بعد ہم ایک ٹیکسی کے ذریعہ مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے۔

پاکستان کو سیاسی اعتبار سے جس شدید کشمکش میں چھوڑ کر آئے تھے اسکی بنا پر وطن میں رہتے ہوئے ہر آن دل مضطرب، ذہن مشوش و فکر مند اور نئی خبروں کیلئے گوش بر آواز تھا۔ لیکن ارض مقدس کی یہ برکت کھلی آنکھوں مشاہدے میں آئی کہ جدہ پہونچتے ہی ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے تشویش واضطراب کے دہکتے ہوئے الاؤ سے اٹھا کر امن و سکون کے گلزار میں پہونچا دیا ہو۔ اب نہ وہ سیاسی ہاؤ ہو تھی نہ وہ خطرے اور اندیشے تھے، نہ وہ اضطراب تھا، اب تو دل و دماغ سے لیکر گوش و زبان تک ایک ہی دھن تھی کہ لبیک اللھم لبیک لبیک لا شریک لک لبیک۔

یہاں کا موسم خلاف توقع کراچی سے زیادہ خوشگوار تھا، اور مکہ مکرمہ جانیوالی شاہرہ پر روح پرور ہواؤں کے جھونکے اندرونی کیف و نشاط کے مہمیز کام کر رہے تھے۔ جدہ سے باہر نکلے تو سورج غروب ہو چکا تھا، اور ہماری لبیک کی صداؤں کے جواب میں ٹیکسی ڈرائیور نے مکہ ریڈیو کھولدیا جہاں سے حرم کی

اذان مغرب نشر ہو رہی تھی۔ صحرائے عرب کے سناٹے میں مؤذن کی آواز دور تک پھیلتی چلی گئی اور اس نے قلب وروح کی گہرائیوں تک کو سرشار کر دیا۔ اسی مقدس صحراء میں نہ جانے کتنے صحابہؓ، کتنے تابعینؒ کتنے اولیاءؒ اور کتنے مجاہدین کی اذانیں گونجی ہونگی! اس تصور نے ذہن میں صدیوں کی تاریخ کے دفتر کھول دیئے، اور نگاہ تصور کہاں سے کہاں پہونچ گئی؟ اذان ختم ہوئی تو ڈرائیور نے خود ہی سڑک کے ایک کنارے گاڑی روک دی، اور ہمیں نماز کی دعوت دیتے ہوئے نیچے اتر گیا۔ جماعت شروع کی تو ہم پانچ آدمی تھے، لیکن نماز کے دوران گاڑیاں آکر رکتی رہیں، اور لوگ جماعت میں شامل ہوتے رہے یہاں تک کہ جب سلام پھیرا تو پیچھے اچھی خاصی طویل صف بن چکی تھی۔

مکہ مکرمہ میں کانفرنس کے مندوبین کے لئے قیام کا انتظام ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں کیا گیا تھا۔ یہ ہوٹل مکہ مکرمہ شہر سے باہر جدہ روڈ پر واقع ہے اور کراچی کا ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل آرائش و آسائش کے اسباب کے لحاظ سے اس کے مقابلے میں نہایت فروتر ہے، کانفرنس کی وجہ سے اس ہوٹل کو اور زیادہ سجایا گیا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دنیا سے الگ ایک خوابوں کی دنیا بسادی گئی ہے، جو کمرہ ہمیں دیا گیا وہ اعلیٰ ترین فرنیچر، ریڈیو رنگین ٹیلی ویژن، ٹیلی فون، اور ایئر کنڈیشنڈ غرض تمام جدید ترین اسباب سے لیس تھا، اور اس کا کرایہ ساڑھے تین سو ریال (پاکستانی ایک ہزار روپیہ سے زائد) یومیہ تھا۔ لیکن یہاں پہونچ کر بار بار یہ احساس دل میں چبھتا رہا کہ مکہ مکرمہ پہونچ کر بھی حرم محرم سے اتنی دور رہنا بہت بڑی محرومی ہوگی۔ اگرچہ پانچوں نمازوں کے اوقات میں حرم شریف لے جانے کے لئے بس کا انتظام تھا، لیکن یہاں رہتے ہوئے حسب خواہش حرم شریف کی حاضری مشکل تھی۔ چنانچہ اسی رات میں احقر یہاں سے فندق مکہ منتقل ہو گیا جو حرم شریف کے باب سے بالکل متصل ہے، اور گزشتہ سال رمضان میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مکہ مکرمہ حاضری ہوئی تھی تو یہیں قیام ہوا تھا۔ فندق مکہ منتقل ہونے کی کارروائی میں آدھی رات گذر گئی، اور رات کے وقت عمرہ ادا کرنا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ عمرہ کی سعادت فجر کے بعد حاصل ہوئی اور ناشتہ کے بعد کانفرنس میں شرکت کے لئے انٹر کانٹی نینٹل جانا ہوا۔

اس کانفرنس کا موضوع یہ تھا کہ دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے نظامہائے تعلیم کا جائزہ لے کر یہ دیکھا جائے کہ ماضی میں مسلمانوں کا نظام تعلیم کیا تھا؟ انگریزی استعمار کے عہد میں اس میں کیا تبدیلی ہوئی؟ اور اس کے نتائج کیا نکلے؟ اور اب وہ کن اصلاحات کا محتاج ہے؟ اس غرض کے لئے دس ۱۰ ماہ پہلے دنیا کے تقریباً ہر بڑے خطے میں چند افراد کو ایک سوالنامہ بھیج دیا گیا تھا کہ وہ اسکی روشنی میں اپنے یہاں مسلمانوں کی تعلیمی حالت پر ایک مفصل رپورٹ مرتب کریں۔ پاکستان میں دینی تعلیم

سے متعلق رپورٹ کی ترتیب احقر کے سپرد کی گئی تھی۔ چنانچہ بیشتر اہم ممالک کے مندوبین نے یہ رپورٹیں خلاف توقع محنت اور اہتمام کے ساتھ مرتب کر کے کانفرنس کے انعقاد سے پہلے ہی بھیج دی تھیں۔ اور کانفرنس کے آغاز پر ان سب سائیکلو اسٹائل کاپیاں مندبین میں تقسیم کردی گئی تھی جو تقریباً سات جلدوں میں مجلد تھیں، اور ان رپورٹوں کا یکجا ہو جانا اس کانفرنس کا شاید سب سے بڑا اعلیٰ فائدہ تھا۔

ان تمام رپورٹوں کا مطالعہ کر کے مسلمانوں کے نظام تعلیم پر ایک مجموعی تبصرہ اور آئندہ کے لئے تجاویز مرتب کرنے کا کام معروف مصری عالم استاذ محمد المبارک کے سپرد تھا، اور انھوں نے ایک مقالے میں ان رپورٹوں کا خلاصہ اور تجاویز مرتب کی تھیں۔ میں استاذ محمد المبارک سے پہلے شخصی طور پر متعارف نہ تھا، لیکن پہلے ہی دن چائے کی وقفے میں انہوں نے حضرت مولانا علی میاں سے باتیں کرتے ہوئے احقر کے بارے میں پوچھا، اور کہا کہ اسکی رپورٹ بڑی اہم تجاویز پر مشتمل ہے جنھیں میں نے اپنے مقالے میں شامل کر لیا ہے، اس پر احقر نے اپنا تعارف کرایا، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے احقر کی نسبت معلوم کر کے وہ بڑے خوش ہوئے، اور دیر تک انہی کی باتیں کرتے رہے۔ (ان کے مقالے کا اردو ترجمہ انشاء اللہ البلاغ کی کسی آئندہ اشاعت میں پیش کیا جائیگا)۔

کانفرنس میں روزانہ مغرب کے بعد کھلا اجلاس ہوتا جس میں مقالے پڑھے جاتے، لیکن صبح کے کام کے لئے کانفرنس کو ابتداء ہی سے چودہ کمیٹیوں پر تقسیم کر دیا گیا تھا، ہر کمیٹی کا ایک مخصوص موضوع تھا جس پر غور کر کے اسے قرار دادیں مرتب کرنی تھیں۔ چنانچہ صبح سے ظہر تک اور عصر کے بعد ان کمیٹیوں کے بند اجلاس ہوتے تھے دینی تعلیم سے متعلق کمیٹی میں احقر بھی شامل تھا چھ روز کی نشستوں میں دینی مدارس کے طریق کار سے متعلق کافی بحث و مباحثہ رہا۔ یہ بات افسوسناک تھی کہ برصغیر کے ہزارہا دینی مدارس کی نمائندگی کے لئے صرف حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہم اور اس ناچیز کو دعوت دی گئی تھی، حدیہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند سے بھی کوئی شخص مدعو نہ تھا۔ اس لئے دینی مدارس کے موقف کی وضاحت میں قدرے دشواری پیش آئی، لیکن تبادلہ خیال کے بعد کمیٹی کے تمام ارکان مندرجہ ذیل نکات پر متفق ہوگئے اور بالآخر ان نکات کو پوری کانفرنس نے بھی منظور کر لیا:۔

(۱) جب تک عام تعلیمی اداروں (اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں، کے تعلیمی نظام میں انقلابی تبدیلیاں لاکر اسے خالص اسلامی رنگ میں پوری طرح رنگ نہیں دیا جاتا (جس کے لئے کانفرنس نے الگ تجاویز مرتب کی ہیں) اس وقت تک دینی تعلیم کے روایتی مراکز کو علیٰ حالہا قائم رکھ کر ان کی پوری حفاظت کی جائے اور ان کی آزادی کو برقرار رکھا جائے۔

(۲) دینی تعلیم کے مراکز سے سفارش کی جائے کہ وہ اپنی خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے

نصاب تعلیم میں الہامی علوم کے ساتھ تازہ ترین کسبی علوم کی اتنی مقدار شامل کریں جو طلباء کی معلومات کا افق وسیع کرنے اور عہد حاضر کے لادینی نظاموں کے چیلنج کا مقابلہ کرنے میں معاون ہو سکے۔

(۳) جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں مسلمانوں کی دینی تعلیم کا انتظام اس طرح کیا جائے کہ وہ حکومتوں کی مداخلت کے بغیر ٹھیٹھ دینی تعلیم ضروری حد تک حاصل کر سکیں اور اس کے ساتھ انھیں کسبی علوم کی اتنی مقدار پڑھائی جائے جو ان کو سرکاری ملازمتوں کے حصول میں مدد دے سکے۔ اس غرض کے لئے مسلمان حکومتیں ان اقلیتوں کی تعلیم کے بندوبست کیلئے ایک مستقل ادارہ قائم کریں۔

(۴) مسلمان حکومتوں کے تعاون سے ایسے مستقل ادارے قائم کئے جائیں جو اساتذہ کی تربیت کے لئے مختص ہوں اور جن کے ذریعے دینی ذہن ومزاج رکھنے والے ماہر اساتذہ تیار کئے جا سکیں۔

کانفرنس کے اختتام سے ایک روز قبل چودہ ۱۴ کمیٹیوں کا اب مشترک اجلاس ہوا جس میں تمام کمیٹیوں کی منظور کردہ تجاویز تمام مندوبین کے سامنے پیش کی گئیں، اور ان پر بحث ومباحثہ کے بعد ان میں ترمیمات تجویز ہوئیں۔ اور کانفرنس کے آخری اجلاس میں ان تجاویز کو ترمیم شدہ شکل میں پوری کانفرنس کی طرف سے منظور کر لیا گیا۔ اس طرح چالیس ۴۰ سے زائد قرار دادیں منظور کی گئی اور قرار دادوں کی حد تک بلاشبہ کانفرنس بخیر وخوبی اختتام کو پہنچی۔ چند اہم قرار دادیں درج ذیل ہیں:۔

۱۔ کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ موجودہ عام تعلیمی اداروں میں جو علوم پڑھائے جا رہے ہیں (اور جو موجودہ حالات میں مغربی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، ان کی از سرنو اس طرح تدوین کی جانی چاہئے کہ اسلامی عقائد ان میں پیوست ہو جائیں، اور ان کو پڑھ کر طلباء کا دینی مزاج گہرا ہو سکے، مثلاً سائنس کی تعلیم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا استحضار پیدا ہو۔ یہ تدوین تو اس لئے بھی ضروری ہے کہ یورپی فکر نے علوم کو مذہب سے کاٹ کر اور مذہب اور سائنس کے درمیان جو مصنوعی خلا پیدا کیا ہے اسے ختم کیا جا سکے۔ کانفرنس مزید اس بات کی ضرورت پر زور دیتی ہے کہ تعلیم کے موجودہ نظام اور نصاب میں لادینی فکر نے جو باتیں اسلامی عقائد اور اسلامی تصورات کے خلاف شامل کر کے انھیں موجودہ علوم کے ساتھ یکجان کر دیا ہے، ایسی باتوں سے مسلمانوں کے نظام تعلیم کو بالکل پاک کیا جائے۔

کانفرنس مزید اس بات پر زور دیتی ہے کو نئے نظام تعلیم میں سائنس کے قطعی حقائق اور

سائنس دانوں کے ان قیاسات و نظریات کے درمیان واضح طور پر فرق کیا جائے جو قطعی طور پر ثابت نہیں ہو سکے، کیونکہ اول الذکر میں اسلام کے خلاف کوئی بات نہیں ہوتی، جب کہ موخر الذکر میں بہت سے باتیں اسلام کے خلاف ہو سکتی ہیں۔

کانفرنس اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ قرآن کریم میں جو آیات آفاق و کائنات سے متعلق ہیں ان کو سائنس دانوں کے قیاسات و نظریات پر منطبق کرنے کی کوشش سے پرہیز کیا جائے، الا یہ کہ کوئی سائنٹیفک حقیقت جو قطعی طور پر ثابت ہو چکی ہے، واضح طور پر قرآن کریم سے معلوم ہوتی ہو۔ کیونکہ سائنسی نظریات پر قرآن کو منطبق کرنے کی کوشش قرآن کی کوئی خدمت نہیں کرتیں، بلکہ جب ایسے نظریات غلط ثابت ہوتے ہیں تو یہ کوششیں قرآن کریم کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کا سبب بنتی ہیں۔

۲۔ کانفرنس اس بات کی سفارش کرتی ہے کہ اجتماعی علوم کا ایک ایسا مجموعہ تیار کرنا چاہئے جس کے مناہج اسلام کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوں، تاکہ اس مجموعہ علوم کو مغرب کے اجتماعی علوم کی جگہ رکھا جا سکے۔ اس غرض کے لئے کانفرنس اسلامی حکومتوں سے سفارش کرتی ہے کہ وہ اس کام کے اہل علماء کے لئے ایسے اسباب و وسائل فراہم کرے جن کے ذریعہ وہ تحقیق و نظر کا یہ اہم کام سرانجام دے سکیں، نیز اس ضمن میں قدیم اسلامی لٹریچر کی جو کتابیں معاون ہو سکتی ہوں انکی جدید ترین طباعت و اشاعت کا انتظام کیا جا سکے۔

۳۔ کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ عالم اسلام کے تمام لاء کالجوں میں فقہ اسلامی کی تدریس لازمی قرار دیجائے، اور عصر حاضر کے مسائل کے حل کے لئے فقہ اسلامی جو رہنمائی فراہم کرتا ہے اسے نمایاں کر کے بتایا جائے کہ اسلامی معاشرے میں فقہ کے یہ احکام نہ صرف قابل عمل بلکہ واجب العمل ہیں، اور انہی احکام پر عمل کر کے عصری مسائل حل کئے جا سکتے ہیں، کہ اس کے لئے قرآن و سنت کے کسی تحریف یا ان سرمایہ دارانہ یا اشتراکی نظاموں کی ضرورت نہیں ہے جن کے نتائج انتہائی نقصان دہ رہے ہیں۔

۴۔ کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ مسلمان ممالک اپنے نظام تعلیم میں قرآن کریم کی تلاوت، حفظ اور اس کے فہم پر خصوصی توجہ مرکوز کریں، اور مسلمان طلباء کے عقائد و اخلاق اور افکار و تصورات کی تعمیر میں خشت اول قرار دیں۔ اور چونکہ موجودہ حالت یہ ہے کہ تعلیم کے تمام مراحل میں طلباء قرآن کریم سے اس قدر نابلد ہوتے ہیں کہ بڑے بڑے کالجوں سے فارغ ہونے کے باوجود قرآن کریم کی ایک سورت بھی صحیح طریقے سے نہ تلاوت کر سکتے ہیں اور نہ انہیں قرآن کریم کا کوئی معتدبہ حصہ یاد ہوتا ہے، اس لئے کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ تعلیم

کے ابتدائی مرحلے سے قرآن کریم حفظ وناظرہ اور ترجمہ کی تعلیم شروع کی جائے،اور تدریجاً اسکو پڑھایا جائے یہاں تک کہ جب طالب علم ثانوی مدارس سے فارغ ہو تو قرآن کریم کے کم از کم بعض اجزا اسے یاد ہوں،اور وہ اسکے عمومی مفاہیم کو سمجھ سکتا ہو۔

اسی طرح کانفرنس اس بات کی سفارش کرتی ہے کہ عالم اسلام کے طول وعرض میں حفظ قرآن کے مدارس کثرت سے قائم کئے جائیں۔

نیز کانفرنس یہ سفارش بھی کرتی ہے کہ تعلیم کے تمام مراحل میں حدیث شریف کی تعلیم پر بھی خصوصی توجہ دیجائے۔

۵۔ کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ خاص طور پر تجربی علوم کی عملی درسگاہوں میں ان علوم اور ان کی تاریخ کے دوران اس پہلو پر خاص زور دیا جائے کہ ان علوم کو موجودہ معیار تک پہنچانے میں مسلمان اہل علم کا کیا کردار رہا ہے؟ان کی تحقیقات کیا رہی ہے؟علم کے میدان میں انھوں نے انسانیت کو کیا دیا ہے؟نیز اس حقیقت کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے دنیا کو سب سے پہلے تجربی طریق تحقیق سے آشنا کیا،اور اس میدان میں یورپ کی عصری ترقیات درحقیقت اسی منہاج کی بنیاد پر استوار ہوئی ہیں جسکی داغ بیل مسلمانوں نے طب،فلکیات،طبیعات،اور کیمیا ریاضی میں ڈالی تھی۔

۶۔ کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ عام تعلیمی اداروں میں دینیات کا نصاب مرتب کرتے وقت نیز اس نصاب کے لئے کتابوں کی تالیف کے وقت،ان عقائد کو اہمیت دیجائے جو قرآن وسنت اور سلف صالحین کے اقوال سے ماخوذ ہیں ان کتابوں میں آیات اللہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اجاگر ہونے چاہئیں اور ان میں دشمنان اسلام کے رائج کئے ہوئے شبہات کا جواب ہونا چاہئے۔

۷۔ کانفرنس کو اس بات کا احساس ہے کہ عرب اور غیر عرب دونوں قسم کے اسلامی ممالک میں طلباء کی عربی دانی کا معیار بہت کمزور ہورہا ہے،لہٰذا کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ عربی زبان کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے اور دینی مواد کو عربی زبان کے ذریعے پڑھایا جائے (خاص طور پر عرب ممالک میں)۔

کانفرنس یہ سفارش بھی کرتی ہے کہ تمام علوم حاضرہ کو عربی زبان میں منتقل کرنے کے لئے موثر اقدامات کئے جائیں۔اور اس راہ میں جو کوششیں اب تک ہوچکی ہیں ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔

۸۔ کانفرنس کو اس بات پر تشویش ہے کہ عالم اسلام کے جو طلباء اعلیٰ تعلیم کیلئے غیر ممالک

جاتے ہیں وہ اکثر عقائد واخلاق اور افکار و تصورات کے لحاظ سے فتنے کا شکار ہو جاتے ہیں لہٰذا کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ اولاً عالم اسلام کے اندر ایسے اعلیٰ تعلیم کے مراکز قائم کرنے کے لئے کوششیں جاری رکھی جائیں جو طلباء کو باہر جانے سے مستغنی کر سکیں، ثانیاً صرف تخصصات کے طلباء کو باہر بھیجا جائے گا جنکی تعلیم عالم اسلام میں ممکن نہیں، ثالثاً اس غرض کے لئے طلباء کا انتخاب کرتے وقت ان کی دینی واخلاقی حالت کو بطور خاص ملحوظ رکھا جائے. اور صرف اعلیٰ درجے کے استعداد کو باہر بھیجنے کے لئے کافی نہ سمجھا جائے. تاوقتیکہ طالب علم کی دینی اور اخلاقی حالت قابل اعتماد نہ ہو۔

۹۔۔۔ کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ عالم اسلام کے بہترین دماغ جو تیزی سے عالم اسلام کو چھوڑ کر غیر ممالک میں سکونت اختیار کر لیتے ہیں، ان کو روکنے اور جو پہلے جا چکے ہیں انھیں واپس بلانے کے لئے عالم اسلام میں ایسے محرکات پیدا کئے جائیں جو ایسے دماغوں کے لئے علمی تحقیق کے مواقع فراہم کریں، ان کی حوصلہ افزائی کریں اور ان کے سامنے بہتر وسائل معاش پیش کر سکیں۔

۱۰۔۔۔ تعلیم نسواں کے بارے میں کانفرنس کا موقف یہ ہے کہ جن ممالک نے مخلوط طریقہ تعلیم اختیار کیا ہے اور عورتوں کی بھی اسی نصاب کی تعلیم دی ہے، جو دراصل مردوں کی فطری مناسبت کے پیش نظر مرتب کیا گیا تھا، اور عورتوں کے لئے نصاب تعلیم بنانے میں عورت کے اپنے مسائل، اپنے مقصد تخلیق اور اس کے انسانی اور سماجی کردار کی طرف توجہ نہیں دی. وہ اپنے معاشرے میں شدید اخلاقی عدم استحکام، خاندانی تفریق اور نوجوانوں کے اخلاقی انحطاط کا تجربہ کر رہے ہیں۔ کانفرنس کے نظر میں یہ تمام باتیں اسلام اور صحت مند رجحانات کے منافی ہیں۔

لہٰذا کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ عالم اسلام میں عورتوں کے لئے ایک الگ نظام تعلیم بنایا جائے جو تعلیم کے تمام مراحل میں عورتوں کو مردوں سے الگ تعلیم دے، جو زیادہ وقت نظر سے سائنٹیفک بنیادوں پر بنایا گیا ہو۔ اس نظام کو عورتوں کے مقصد تخلیق اور سوسائٹی میں ان کے حقیقی طور پر مطلوب کردار سے ہم آہنگ ہونا چاہئے. اور اسلام نے مرد و عورت کے لئے، جن صحت مند رجحانات کے تحفظ کو اپنے مقاصد میں شامل کیا ہے یہ نظام ان کے مطابق ہونا چاہئے جس سے معاشرے کا خاندانی ڈھانچہ استوار رہ سکے اور اصلاح و تقوی کی ترویج میں مدد ملے۔

ان تحفظات کے ساتھ عورتوں میں زیادہ سے زیادہ تعلیم پھیلانے کیلئے موثر اقدامات

کرنے چاہئیں، کیونکہ اسلام نے مرد و عورت دونوں کے لئے تحصیل علم کو ضروری قرار دیا ہے۔

۱۱___ کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ عالم اسلام میں نوجوانوں کی ایسی تنظیمیں قائم کی جائیں جو طلباء کے لئے اسلامی معاشرے کے شایان شان غیر نصابی سرگرمیوں کی طرف دعوت دے سکیں، اور بحالات موجودہ طلباء کی جو غیر نصابی سرگرمیوں اسلامی اقدار کے منافی ہیں، آئندہ ان سے طلباء کو محفوظ رکھ سکیں۔

۱۲___ کانفرنس مسلم ممالک کے ذرائع نشرواشاعت سے سفارش کرتی ہے کہ وہ ان وسائل کے ذریعے ایسے پاکیزہ پروگرام پیش کریں جو اسلامی طرز فکر کے حامل ہوں اور دین اور علم کے درمیان رابطہ پیدا کر سکیں اور جن کے ذریعے علم سے دینی مزاج پیدا کرنے کا کام لیا جا سکے۔

نیز کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ عالم اسلام کے وسائل نشرواشاعت ایسے اسلامی فنون کو منظر عام پر لانے کی سنجیدہ کوشش کریں جو اس خلا کو پر کر سکیں جسے بحالات موجودہ گھٹیا فلموں، ڈراموں، فحش تصاویر اور دوسرے اخلاق سوز پروگراموں نے پر کر رکھا ہے۔

۱۳___ کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ عالم اسلام کے جن ممالک کے پاس مادی امکانات و وسائل کی فروانی ہے ان میں سے کوئی ملک اسلامی نظام تعلیم کا عملی تجربہ پیش کرنے کیلئے آگے بڑھے اور ایک ایسا عملی نمونہ پیش کرے جس سے دوسرے ممالک اس کانفرنس کی تجاویز پر عمل کرنے میں مدد لے سکیں۔

۱۴___ جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ بطور خاص اہمیت کا حامل ہے، اور مسلم ممالک کی طرف سے خصوصی امداد و اعانت کا محتاج ہے۔ لہٰذا کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ مسلمان حکومتوں کے چندے سے ایک فنڈ قائم کیا جائے جو دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کو اسلامی مدارس کھولنے میں مدد دے سکے۔

نیز کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ مسلمان اقلیتوں کو نصابی کتب فراہم کرنے کے علاوہ دینیات اور عربی زبان کے اساتذہ بھی مسلمان ملکوں کی طرف سے فراہم کئے جائیں۔ اور جن ممالک میں وہ اقلیتیں آباد ہیں انکی حکومتوں پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے انھیں اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ مسلمانوں کو اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے کی اجازت دیں اور انکی اسانید کو منظور کریں۔

کانفرنس خاص طور پر عرب ممالک سے سفارش کرتی ہے کہ وہ غیر عرب ممالک کے طلباء کے لئے عربی زبان سکھانے کے مراکز زیادہ سے زیادہ قائم کریں، اور مسلمان اقلیتوں کو زیادہ سے زیادہ تعلیمی وظائف مہیا کریں۔

۱۵۔ کانفرنس جامعہ الملک عبدالعزیز سے سفارش کرتی ہے کہ وہ ایک ایسا تعلیمی مرکز قائم کرے، جو مختلف مسلمان ممالک کے ایسے ماہرین تعلیم پر مشتمل ہو، جو مختلف علمی، تعلیمی اور ثقافتی میدانوں میں مصروف عمل ہیں۔ یہ مرکز مندرجہ ذیل امور انجام دے گا۔

(الف) ایک ایسی تعلیمی پالیسی کی تدوین جو اسلامی نقطہ نظر پر مبنی ہو اور جس کے اصول، اسلامی مآخذ سے مستناد ہوں، نیز کنڈر کارٹن سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک تمام تعلیمی مراحل اور مضامین کے لئے نصاب کی کتب کی تیاری (ب) ایک دار التراجم کا قیام، جو اول تو قرآن کریم کے ایسے صحیح اور آسان تراجم مرتب کرے، جو موجودہ تراجم میں پائی جانے والی غلطیوں سے پاک ہوں دوسرے عربی زبان کی اہم دینی کتب کا غیر عربی زبانوں میں اور غیر عربی زبانوں کی اہم دینی کتب کا عربی زبان میں ترجمہ کرے۔

(ج) ایک ایسی پالیسی کی ترتیب جس کے تحت اسلامی تعلیم کے مختلف میدانوں میں کام کرنے والے اشخاص اور اداروں کے درمیان رابطہ اور باہمی تعاون پیدا کیا جاسکے۔

۱۶۔ حالیہ کانفرنس میں جو مقالات اور رپورٹیں پیش کی گئی ہیں وہ چونکہ انتہائی عظیم علمی اہمیت کی حامل ہیں، اس لئے کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ کانفرنس کی قرار دادوں کو نافذ کرنے والی کمیٹی فوراً کانفرنس کی پوری کارروائی کو شائع کرنے کا کام شروع کردے، تاکہ یہ کارروائی علمی و اسلامی اداروں اور مسلمان حکومتوں کے لئے اسلامی تعلیم مرتب کرنے کے لئے رہنما کا کام دے سکے۔

اور اوپر جس عالمی تعلیمی مرکز کے قیام کا ذکر کیا گیا ہے، جب تک اس کا قیام تکمیل پذیر نہ ہو۔ اس وقت تک کے لئے کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ حالیہ کانفرنس کی انتظامی کمیٹی کو "تنفیذی کمیٹی" قرار دے دیا جائے جس کا کام مذکورہ قراردادوں پر عملدرآمد کرانا ہوگا۔

کانفرنس میں اور بھی بہت سی قرار دادیں منظور کی گئیں، لیکن اس عالمی اجتماع کی اہم ترین تجاویز وہی تھیں جن کا خلاصہ اوپر پیش کیا گیا۔

جہاں تک قرار دادوں کا تعلق ہے، بلاشبہ یہ تمام تجاویز مفید، ضروری اور قابل تعریف ہیں۔ اور چالیس ۴۰ ملکوں کے تین سو تیرہ (۳۱۳) نمائندوں کا اس پالیسی پر متفق ہو جانا اور اس کا اعلان کرنا بڑی غنیمت بات ہے۔ لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان تجاویز کو روبہ عمل لانے کا راستہ کیا ہو؟ کانفرنس نے اس مقصد کے لئے عارضی طور پر ایک کمیٹی قائم کی ہے۔ اور آئندہ کے لئے مستقل عالمی مرکز قائم کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ لیکن ان اداروں کی کامیابی کا سارا دارومدار اس بات پر ہے کہ اس کے لئے کیسے رجال کار منتخب کئے جاتے ہیں؟ اور وہ اس مقصد کے خاطر کتنی سرگرمی اور کتنے ولولے کا مظاہرہ کرتے ہیں؟ ادارے عالم اسلام میں بڑے بڑے نیک مقاصد کے لئے بہت قائم ہو رہے ہیں، کانفرنس کی بھی کمی نہیں۔ اور ان تمام کاموں پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے۔ لیکن بسا اوقات رجال کار کا غلط انتخاب اور دوسرے سیاسی تحفظات ان تمام نیک مقاصد پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ اس لئے ہماری دعا بھی ہے اور اپنی حد تک کوشش بھی کہ اللہ تعالیٰ اس مرکز کو ان بلاؤں سے محفوظ رکھے اور یہ صحیح رخ پر کام کرنے کے لائق بن سکے۔ عالم اسلام کا موجودہ بگاڑ درحقیقت بنیادی طور پر تعلیم کے بگاڑ کا نتیجہ ہے۔ اور اگر کبھی عالم اسلام کی قسمت میں صلاح و فلاح مقدر ہے تو وہ تعلیم کی اصلاح کے بغیر ممکن نہیں۔ خدا کرے کہ یہ مرکز اس سمت میں کوئی مفید قدم اٹھا سکے۔ آمین ثم آمین۔

حرمین شریفین کی آغوش میں زندگی کے کچھ دلکش ایام گذارنے کے بعد وطن واپسی ہوئی تو یہاں پھر پورے ملک کو ہنگاموں، افراتفری اور بے چینی کی لپیٹ میں پایا۔ اور امن و سکون کے جو لمحات محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے نصیب ہوئے تھے، ایک خواب ہو کر رہ گئے حرمین شریفین میں بحمد اللہ اپنے ملک کے لئے بہت دعائیں کرنے کی توفیق ہوئی، اور دوسرے مسلمانوں کو بھی پاکستان کے لئے بے چین اور دعا گو پایا۔ امید ہے کہ انشاء اللہ یہ دعائیں ضرور رنگ لائیں گی۔ لیکن بحالات موجودہ ملک کے سیاسی فضا میں ایک دردمند مسلمان کے لئے تشویش و اضطراب کے سوا کچھ نہیں۔

البتہ اس تشویش و اضطراب کے عین درمیان ایک چیز ایسی ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہ کرنا شدید کفران نعمت ہوگا، اور وہ یہ کہ ملک میں شراب، ریس کے جوئے اور نائٹ کلبوں پر پابندی لگ گئی ہے۔ افسوس ہے کہ جس بدامنی، بے چینی اور انتشار کے عالم میں یہ اقدامات کئے گئے ہیں اس کی وجہ سے ان پر قوم خوشی بھی نہیں منا سکی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان واقعات پر بالکل خاموشی سے گذر جانا اللہ

تعالیٰ کی ناشکری معلوم ہوتی ہے۔ یہ وہ چیز تھی جس پر قیام پاکستان کے فوراً بعد عمل ہونا چاہئے تھا. لیکن افسوس ہے کہ تیس ۳۰ سال سے اس ملک کے مسلمان اس قسم کے اقدامات کو ترس رہے ہیں. اگر شراب. جوئے اور نائٹ کلبوں کی پابندی پر کماحقہ. عمل ہو جائے تو یہ ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ کی طرف ایک اہم قدم ہو گا یہ قدم اگرچہ بعد از خرابی بسیار اٹھایا گیا ہے لیکن جب اچھا کام بھی کیا جائے. اور جس کی طرف سے بھی کیا جائے. بہر حال! قابل تعریف اور ملک وملت کے لئے فال نیک ہے۔ اگر موجودہ حکومت اس قسم کے اقدامات امن کی حالت میں از خود کرتی تو یہ اس کا عظیم کارنامہ ہوتا اور اس کا سہرا تمام تر اسی کے سر رہتا. اور شاید ملک اس شدید بحران سے دوچار نہ ہوتا جس نے آج ہر مسمان کو بے چین کیا ہوا ہے. لیکن موجودہ حالات میں ان اقدامات کا اصل سہرا ان جاں نثاروں کے سر ہے جنہوں نے کسی سیاسی مقصد سے نہیں. بلکہ خالص دین کے نام پر اور محض نفاذ شریعت کی آرزو میں اپنی جانیں قربان کیں. اور حکومت کو اس احساس پر مجبور کیا کہ اسلام کے سوا کسی بھی چیز سے عوام کے دل نہیں جیتے جاسکتے۔ اللہ تعالیٰ ان جانثاروں کی روح کو ابدی راحتیں عطا فرمائے اور ہمارے حکام اور سیاسی زعماء کو ایسے اقدامات کی توفیق عطا فرمائے جن کے ذریعے ان جانثاروں کی قربانیوں کا اصل مقصد مکمل طور پر حاصل ہو جائے. اور اس ملک میں صرف اسلام ہی اسلام کا بول بالا ہو۔ آمین ثم آمین۔

(ماہنامہ "البلاغ" جمادی الثانیہ ۱۳۹۷ھ ج ۱۱ ص ۳۲۳)

پاکستان میں دینی تعلیم
کا
ایک سرسری جائزہ

یہ وہ رپورٹ ہے جو احقر نے جامعہ الملک عبدالعزیز مکہ مکرمہ کی عالمی تعلیمی کانفرنس کیلئے لکھی تھی اور جسے وہاں شائع کر کے تقسیم کیا گیا، اور جو کانفرنس کی متعدد تجاویز کیلئے بنیاد بنی۔ اصل رپورٹ عربی میں تھی، مولانا حسین احمد نجیب نے اسے اردو میں منتقل کیا ہے۔ (م ت ع)

پاکستان ایک مسلم مملکت ہے اور اسکی آبادی تقریباً سات کروڑ نفوس پر مشتمل ہے اکثریت مسلمان۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے یہ خطہ برصغیر ہند کا ایک حصہ تھا۔ برصغیر ہند ایک عظیم مملکت تھی جس میں مسلمان، ہندو، عیسائی، یہودی، سکھ اور بدھ وغیرہ بے شمار اقوام بستی تھیں۔ صدیوں تک مغل مسلمان حکمرانوں کی عملداری میں رہا پھر ان سے انگریزی سامراج کے چنگل میں چلا گیا اور تقریباً دو سو سال تک غلامی کی ان زنجیروں میں جکڑا رہا۔

مغربی سامراج کے خلاف برصغیر ہند میں آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو ہندوستان کے مسلمانوں نے انگریز حکمرانوں سے اپنے لئے علیحدہ اور مستقل ایک ایسی مملکت کا پر زور مطالبہ کیا، جس میں مسلمانوں کو مکمل خود مختاری حاصل ہو اور کسی بھی غیر مسلم قوم کی اس کار مملکت میں کسی قسم کی شرکت نہ ہو۔ سندھ، پنجاب، بلوچستان، اور شمالی مغربی سرحدی علاقے مسلمان اکثریت کے خطے تھے، چنانچہ مسلمانوں کے اس مطالبہ کو تسلیم کر کے مسلم اکثریت کے یہ خطے ان کے حوالے کر دیئے گئے۔ انہی علاقوں پر مشتمل اس وفاق کو پاکستان کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس طرح ۱۹۴۷ء میں دنیا کے سیاسی نقشے پر ایک نئی اسلامی مملکت ابھر کر سامنے آئی۔

یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی تعلیمی زندگی کی تاریخ غیر منقسم ہندوستان کی تعلیمی تاریخ سے مربوط ہے

مغل مسلم حکمرانوں کے عہد میں برصغیر ہندوستان علم وہنر کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اس عہد میں جو نظام تعلیم رائج تھا وہ "درس نظامی" کے نام سے مشہور ہے۔ اس نظام تعلیم نے برصغیر ہندوستان میں ہزاروں اہل علم ومعرفت اور ماہرین صنعت وفنون پیدا کئے۔ سب سے پہلے اس تعلیمی نظام کے بارے میں کچھ معلومات پیش خدمت ہیں۔

درس نظامی

درس نظمی ملا نظام الدین شہید سہالوی رحمہ اللہ (متوفی ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۷) کے نام نامی سے منسوب ہے۔ آپ عظیم مسلمان فلسفی، "رسائل الارکان"، فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت" اور "شرح سلم العلوم" جیسی بلند پایہ کتب کے مؤلف۔ بحرلعلوم علامہ عبدالعلی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزندار جمند تھے آپ لکھنؤ کے ایک مضافاتی قصبہ سہالہ میں ۱۰۸۸ھ میں پیدا ہوئے۔ وحید عصر شیخ غلام نقشبندی لکھنوی" (متوفی ۱۱۲۶ھ) شیخ امان اللہ بنارسی" جیسے عظیم اساتذہ اور ماہرین تعلیم کے سامنے زانوئے تلمذ طے کئے اور علوم وفنون میں گہری بصیرت حاصل کی۔ فراغت تعلیم کے بعد اپنے والد ماجد علامہ بحرالعلوم رحمہ اللہ تعالی کی مسند تدریس پر رونق افروز ہوئے آپ کی زیر نگرانی اس مدرسہ نے تمام علوم وفنون میں اپنے دور میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام حاصل کرلیا اور ہندوستان میں سب سے بڑا علمی مرکز قرار دیا گیا۔

ملا نظام الدین سہالوی رحمہ اللہ نے اپنے مدرسہ کے لئے تعلیم کا ایک نظام اور نصاب مرتب کیا اس کو عمل کے تجربہ میں لائے۔ اس نظام تعلیم کی اہم خصوصیات کے پیش نظر ہی ہندوستان کے باقی تمام مدارس نے بھی اسی کو اپنالیا۔ اور ہندوستان پر انگریزی سامراج کے تسلط تک ہندوستان کے تمام تعلیمی اداروں میں یہی نظام تعلیم بنیادی حیثیت سے نافذ تھا۔

درس نظامی کا نصاب مندرجہ ذیل ہے

نمبر شمار	فن	نصابی کتب	مؤلف	سنہ تالیف یا سنہ وفات مؤلف
۱	صرف واشتقاق	میزان الصرف	محمد بن مصطفیٰ بن الحاج حسنؒ	م ۹۱۱ھ
۲	عربی	منشعب		=
۳		پنج گنج	=	=
۴		صرف میر	میر سید شریف الجرجانی رحمہ اللہ	م ۸۱۶ھ
۵		علم الصیغہ	مولانا مفتی عنایت اللہ "	م ۱۲۷۷ھ
۶		فصول اکبری	قاضی محمد اکبر "	معلوم نہیں
۷	عربی نحو	نحو میر	میر سید شریف الجرجانی رحمہ اللہ	م ۸۱۶ھ
۸		شرح مأۃ عامل	ملا محمد صادق "	م ۱۱۹۰ھ
۹		ہدایۃ النحو	ابوحیان نحوی	م ۷۴۵ھ
۱۰		کافیہ	امام جمال الدین ابن حاجب نحوی "	م ۶۲۰ھ
۱۱		شرح جامی	مولانا شیخ عبدالرحمٰن جامی "	م ۸۵۰ھ
۱۲		شرح ابن عقیل علی الفیہ ابن مالک (صرف ـ فعل ہی بحث)	امام عبداللہ بن احمد ابن عقیل رحمہ اللہ	م ۹۹۷ھ
۱۳	بلاغت عربی	تلخیص المفتاح	علامہ جلال الدین محمد بن عبدالرحمٰن قزوینی خطیب دمشق	م ۷۳۹ھ
۱۴		مختصر معانی شرح تلخیص المفتاح	سعدالدین تفتازانی "	م ۷۹۲ھ
۱۵		مطول شرح تلخیص المفتاح	=	=
۱۶	عروض وقوافی	عروض المفتاح	ابوایوب سکاکی "	م ۶۲۶ھ
۱۷	منطق	صغرا وکبریٰ	میر سید شریف الجرجانی رحمہ اللہ	م ۸۱۶ھ
۱۸		ایسا غوجی	اثیرالدین ابہری "	م ۶۶۱ھ

نمبر شمار	فن	نصابی کتب	مؤلف	سن تالیف یا سنہ وفات مؤلف
۱۹		شرح تہذیب تفتازانی	عبداللہ یزدی	م ۹۸۱ھ
۲۰		شرح شمسیہ (قطبی)	قطب الدین رازی	م ۸۶۶ھ
۲۱		سلم العلوم	محب اللہ بہاری	۱۱۱۹ھ
۲۲		رسالہ میر زاہد	میر محمد زاہد ہروی	۱۱۰۱ھ
۲۳	فلسفہ	شرح میبذی علی ہدایۃ الحکمۃ	میر حسین میبذی	م ۱۰۹۶ھ
۲۴		شرح صدرا	محمد بن ابراہیم صدر الدین شیرازی"	م ۱۰۵۰ھ
۲۵		شمس بازغہ	ملا محمود جونپوری "	۱۰۶۲ھ
۲۶	ادب عربی	مقامات حریری	ابو محمد قاسم بن علی حریری	م ۵۱۶ھ
۲۷		دیوان متنبی	احمد بن حسین ابوالطیب متنبی	۴۰۰ھ
۲۸		دیوان حماسہ	ابو تمام طائی	۲۲۲ھ
۲۹		سبعہ معلقہ	زمانہ کے مشہور شعراء	
۳۰	تاریخ	تاریخ الخلفاء	علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ	م ۹۸۱ھ
۳۱		تاریخ ابی الفداء	ابوالفداء حمودی	م ۷۳۶ھ
۳۲	عقائد وکلام	شرح عقائد نسفی	سعد الدین تفتازانی	م ۷۹۲ھ
۳۳		مسامرہ	کمال الدین ابن الہمام رحمہ اللہ	م ۹۰۵ھ
۳۴		خیالی	شمس الدین خیالی	۸۷۰ھ
۳۵	طب	الموجز	ابوالحسن ابن النفیس	م ۶۸۷ھ
۳۶		قانونچہ	محمد بن عمر چغمینی	م ۸ھ
۳۷		حمیات القانون	شیخ بو علی ابن سینا	۴۲۷ھ
۳۸		شرح الاسباب	برہان الدین نفیس بن عوض کرمانی	۸۲۷ھ

نمبر شمار	فن	نصابی کتب	مؤلف	سنہ تالیف یا سنہ وفات مؤلف
۳۹	ہیئت	التصریح	امام الدین بن لطف اللہ لاہوری	م ۱۱۳۵ھ
۴۰		شرح چغمینی	موسیٰ بن محمود قاضی زادہ	م ۸۱۴ھ
۴۱	ہندسہ	بست باب	نصیر الدین محقق طوسی	م ۶۷۲ھ
۴۲		اقلیدس	ابوالحسن ثابت بن قرۃ	۲۸۹ھ
۴۳	مناظرہ	رسالہ رشیدیہ	شمس الحق بن شیخ عبدالرشید	م ۱۰۸۰ھ
۴۴	فقہ	نورالایضاح	حسن ابن علی شرنبلالی	م ۱۱۹۶ھ
۴۵		مختصر القدوری	ابوالحسن قدوری	م ۴۲۸ھ
۴۶		کنزالدقائق	ابوالبرکات نسفی	م ۴۷۰ھ
۴۷		شرح وقایہ	صدر الشریعۃ عبیداللہ بن مسعود	م ۵۴۳ھ
۴۸		ہدایہ	برہان الدین علی مرغینانی	م ۵۷۳ھ
۴۹	اصول فقہ	اصول شاشی	نظام الدین شاشی	م ۷۵۴ھ
۵۰	=	نورالانوار شرح المنار	شیخ احمد ملاجیون "	م ۱۱۰۵ھ
۵۱		مختصر الحسامی	حسام الدین محمد بن محمد بن عمر	۶۴۴ھ
۵۲		التوضیح	صدر الشریعہ عبیداللہ بن مسعود	۵۴۳ھ
۵۳		التلویح	سعد الدین تفتازانی	۷۹۲ھ
۵۴		مسلم الثبوت	محب اللہ بہاری	۱۱۱۹ھ
۵۵	میراث (فرائض)	مختصر السراجی	سراج الدین سجاوندی	معلوم نہیں
۵۶		شریفیہ	سید شریف جرجانی "	م ۸۱۶ھ
۵۷	اصول حدیث	شرح نخبۃ الفکر	حافظ ابن حجر عسقلانی	م ۸۵۲ھ
۵۸	حدیث	مشکوٰۃ المصابیح	شیخ ولی الدین عراقی "	

نمبر شمار	فن	نصابی کتب	مؤلف	سنہ وفات مؤلف
۵۹	حدیث	جامع البخاری	امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ	م ۲۵۶ھ
۶۰		صحیح مسلم	امام مسلم بن حجاج قشیریؒ	م ۲۶۱ھ
۶۱		جامع ترمذی	امام محمد بن عیسیٰ ترمذیؒ	م ۲۷۹ھ
۶۲		سنن ابی داؤد	امام ابو داؤد سلیمان بن اشعثؒ	م ۲۷۵ھ
۶۳		سنن نسائی	امام احمد بن شعیب نسائیؒ	م ۳۰۶ھ
۶۴		سنن ابن ماجہ	امام ابو عبداللہ محمد بن ماجہؒ	م ۲۷۳ھ
۶۵		کتب الشمائل	امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذیؒ	م ۲۷۹ھ
۶۶		شرح معانی الآثار	امام ابو جعفر احمد بن محمد سلامہ طحاویؒ	م ۳۲۱ھ
۶۷		الموطاء	امام مالک بن انس	م ۱۷۹ھ
۶۸		الموطاء	امام محمد بن حسن شیبانیؒ	م ھ
۶۹	تفسیر	تفسیر جلالین شریف	جلال الدین سیوطیؒ وجلال الدین محلی	م ۹۸۱ھ ۹ھ
۷۰		انوار التنزیل	قاضی عبداللہ بن عمر بیضاویؒ	م ۶۱۶ھ
۷۱		مدارک التنزیل	امام نجم الدین عمر نسفیؒ	م ۷۵۳ھ
۷۲	اصول تفسیر	الفوز الکبیر فی اصول التفسیر	امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ	م ۱۱۷۶ھ

یہ نظام تعلیم علوم عربیہ، تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد و کلام، فلسفہ و منطق، ریاضی طب، اور ہندسہ وغیرہ تمام علوم کو جامع تھا۔ درس نظامی چونکہ تمام دینی اور دنیاوی علوم پر مشتمل تھا اس لئے اس نظام تعلیم کے فارغ التحصیل مسلمان طلباء عملی زندگی کے ہر شعبے کی ذمہ داریاں اٹھالینے کی استعداد رکھتے تھے۔ چنانچہ ہر شخص اپنے ذوق اور صلاحیتوں کے مطابق زندگی کے جس شعبہ کو پسند کر کے اختیار کر لیتے اس میں اسکو ترقی کے تمامتر مواقع میسر رہتے تھے۔

غرضیکہ اس نظام تعلیم کے زیر تربیت کبار علماء مفسرین، محدثین، فقہاء، متکلمین فلاسفہ، ادباء اور مصنفین کی طرح ماہرین طب و سائنس، بڑے بڑے آفیسر اور ماہرین قانون بھی پیدا ہوئے۔ یہ لوگ علم وفن کے میدان میں مکمل دستکار رکھتے تھے۔

اس نظام تعلیم کے بنیادی اور اساسی مقصد یہ تھا کہ آدمی اپنے دین میں مکمل رسوخ حاصل کرے اور اپنے عقائد میں پختگی پیدا کر کے اپنی عملی زندگی کو دینی بنیادوں پر استوار کرے نیز اپنے معتقدات اور

عمل کی صحت و درستی کے دلائل سے کماحقہ واقف ہو سکے تاکہ اجنبی نظریات اس کو کسی دھوکے میں مبتلاء نہ کر سکیں اور ہوا و ہوس غلط راستوں پر ڈال دینے میں کامیاب نہ ہو سکے اس وجہ سے فراغت کے بعد طالب علم بے خوف و خطر طب و سائنس کا شعبہ اختیار کر لے یا فلسفہ و منطق کا۔ خواہ تفسیر حدیث اور فنون کے شعبوں کو اپنا لے اس کے راہ راست سے بھٹک جانے کا کوئی اندیشہ نہ ہوتا تھا۔

مذکورہ بالا کتب اس نظام تعلیم کے اسی اساسی اور بنیادی مقصد کی طرف مکمل رہنمائی کرنے کے ساتھ طلباء میں صحیح علمی ذوق بھی پیدا کر دیتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ اس نظام تعلیم کا اساسی اور بنیادی مقصد طلباء میں صحیح ذوق پیدا کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظام تعلیم کے ماہرین نے نصابی کتب کے تغیر و تبدل کے بارے میں کسی جمود سے کام نہیں لیا کہ انہی مخصوص کتب پر انحصار کئے رکھتے۔ بلکہ اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہندوستان کے ارباب مدارس دینیہ اس نصاب "درس نظامی" کو اساس کے طور پر تو اختیار کئے ہوئے ہیں لیکن حالات و واقعات کے تبدل و تغیر کے ساتھ اس میں حذف و اضافہ بھی کرتے رہے۔ البتہ اس ضمن میں اس بات کا خصوصی خیال رکھا گیا کہ "درس نظامی" کی حقیقی روح اور اغراض و مقاصد کسی بھی طور پر متاثر نہ ہونے پائیں۔ چنانچہ سلطنت مغلیہ کے زوال تک ہندوستان کے تقریباً تمام مدارس میں "درس نظامی" کی یہی روح کئی صدی تک یوں ہی کار فرما رہی۔

برصغیر ہند پر انگریزی سامراج کے مسلط ہو جانے کے بعد انگریزوں نے یہاں پر ایک جدید نظام تعلیم کے نفاذ کا پروگرام مرتب کیا ـــــ یہاں اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وقت کے مروجہ نظام تعلیم (درس نظامی) میں بعض جدید علوم و فنون کا اشد ضروری تھا. کیونکہ مغربی فلاسفہ اور سائنس دانوں نے فلسفہ و سائنس کی بہت سے جدید موضوعات اور مباحث کا اضافہ کیا تھا. یہ تغیر اگر مسلم حکمرانوں کے عہد میں واقع ہوتا تو یقیناً وہ اس جدید فلسفہ و سائنس کا درس نظامی میں اس انداز سے اضافہ کر دیتے کہ اس سے ان کے نظام تعلیم کی حقیقی روح بھی متاثر نہ ہوتی اور نہ اس کے اغراض و مقاصد کو کوئی نقصان پہنچ پاتا۔

لیکن بدقسمتی سے یہ تغیر انگریزی دور حکومت میں رونما ہوا. اور انھوں سے نہ صرف یہ کہ اس نظام تعلیم کے اغراض و مقاصد کی کچھ پرواہ نہ کی بلکہ اس کے علی الرغم اپنی تمام تر کوشش اس کام میں لگا دی کہ مسلمانوں کے قلوب سے دین اسلام اور اللہ و رسول سے محبت کے ہر پہلو کو محو کر دیا جائے۔ انگریز سامراجیوں نے فلسفہ و سائنس کے علوم میں اس تغیر کو بہانہ بنا کر تعلیم کے اس نظام کو. جو قلوب و اذہان میں ایمان و حکمت کی آبیاری کرتا تھا. سرے ہی سے تبدیل کر دینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ چنانچہ اس نے

مدارس میں تعلیم وتربیت کا ایک ایسا جدید نظام نافذ کردیا. جس نے مسلمانوں کے نظام تعلیم کے اغراض ومقاصد کو ہی الٹ کر رکھ دیا۔ اس جدید نظام تعلیم میں علوم قرآن وسنت اور مسلمانوں کے اسلاف کے تذکروں کو تقریباً سرے سے اڑادیا گیا۔ اور صحیح دینی فکرونظر سے یکسر محروم کردیا۔

بظاہر انگریزوں کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو جدید علوم سے آراستہ کرنا چاہتے ہیں. لیکن اس دعوی کے پس پردہ درحقیقت یہ مقاصد کارفرما تھے کہ مسلمانوں کے قلوب میں مغربی علوم وتمدن کے تفوق کے ذریعہ مغرب کی بالادستی کو راسخ کردیا جائے. جسکا یقیناً یہ نتیجہ ہوگا کہ مسلمانوں کے اپنے علوم وتمدن وتہذیب اور قومی تشخص ونظام تعلیم وغیرہ تمام امور انکی نظروں میں حقیر اور بے معنی ہوکر رہ جائیں گے۔ چنانچہ اس جدید نظام تعلیم کے بانی ومرتب لارڈ میکالے نے ہندوستانیوں کے تعلیمی امور پر بحث کے دوران برطانوی دارالعوام کے ایک اجلاس میں واشگاف الفاظ میں اپنے مقاصد کا یوں اظہار کیا تھا کہ:۔

> "ہمارے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ ہم ہندوستانی نوجوانوں کے اذہان وقلوب کو بدل ڈالنے کی کوشش کریں. ہم ان کو ہندوستانی عوام اور اجنبی حکمرانوں کے درمیان رابطہ کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں. ہمیں ان لوگوں کی تربیت اس انداز سے کرنا ہے کہ نسل ورنگ کے اعتبار سے تو یہ ہندوستانی ہی رہیں. لیکن ذہنی وفکری انداز خالصتہً انگریزی ہونا چاہئے"؟

اندازہ لگائے کہ اس جدید نظام تعلیم کی ترویج میں پس پردہ انگریزوں کے مقاصد کس قدر گھناؤنے تھے۔

الغرض یہ جدید نظام یکے بعد دیگرے ہر علاقے میں پھیلتا چلا گیا حتی کہ پورے ہندوستان میں اس کا رواج ہوگیا۔ مسلمانوں نے اس خوش فہمی میں اسے خوش آمدید کہا کہ اس طرح جدید علوم اور ٹیکنیکل صنعتوں سے وہ بھی فوائد حاصل کرسکیں گے. اور دیگر ہندوستانی اقوام کے شانہ بشانہ چلنے کی ان میں بھی استعداد پیدا ہوسکے گی۔ دوسری طرف حکومت نے تمام سرکاری ونیم سرکاری ملازمتوں کے لئے صرف اس جدید نظام تعلیم کے تربیت یافتہ افراد کے قبول کئے جانے کا اعلان کرکے درس نظامی کے فارغ التحصیل تمام افراد کے لئے معاش کے دروازے بند کردیئے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ہندوستانی باشندوں کی عظیم اکثریت انہی سرکاری تعلیمی اداروں کی جانب امڈ پڑی اور ایک انتہائی قلیل تعداد کے سوا پوری قوم نے قدیم طرز کے دینی تعلیمی مدارس کے بارے میں عمل طور پر سردمہری بلکہ بے توجہی کا رویہ اختیار کرلیا۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ درس نظامی کے تحت چلنے والے مدارس کی تعداد روز بروز

گھٹتی چلی گئی۔

اس صورتحال نے ہندوستان کے علماء کرام کو چونکا دیا۔ ان کو علوم دینیہ کے ضائع ہوجانے کا شدت سے احساس ہونے لگا۔ چنانچہ علوم دینیہ کی حفاظت اور ان کی نشرواشاعت کے پیش نظران حضرات نے درس نظامی کی تعلیم کے لئے نئے مدارس کھولنے کی طرف پوری توجہ دینی شروع کردی. علماء کی ایک جماعت نے ان حضرات کی دعوت پر لبیک کہا. کم آمدنی حتی کہ فقروتنگ دستی کو گلے سے لگایا اور علوم اسلامیہ کی حفاظت کیلئے اپنی زندگیاں وقف کردیں۔

یہی وہ بڑا سبب ہے جسکی وجہ سے دینی اور دنیاوی. دو الگ الگ شعبوں میں مسلمانوں کا تعلیمی نظام منقسم ہوکر رہ گیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ سرکاری اسکولوں اور کالجوں نے علوم دینیہ سے بیگانگی کا رویہ اختیار کرکے خالصتہً جدید علوم وفنون کی ترویج وتعلیم کو ہی اپنا محور ومقصد قرار دے لیا.اور دینی مدارس نے جدید مروجہ علوم سے قطع نظر کرکے علوم دین اور اس کے مقتضیات ہی کی تعلیم وتعلم کے لئے خود کو وقف کرلیا۔

گو اس دور میں بعض علماء نے ایسے بھی مدارس قائم کئے جن میں جدید قدیم. اور دین دنیا. دونوں علوم کو یکجا کرنے کی ایسی کوششیں کی گئیں جن میں علوم جدیدہ کی تعلیم اس طرح دیجاتی کہ طلباء الحاد کی راہ پر لے جانے والی اور دین سے نفرت پیدا کرنیوالی. کفار کی دیسہ کاریوں سے کچھ بھی متاثر نہ ہوسکتے۔ لیکن یہ کام اتنا بڑا تھا کہ اس کے لئے وسیع تر مادی وسائل.قدیم وجدید علوم پر حاوی ماہرین اساتذہ اور علوم جدیدہ کی تعلیم کے لئے نئی کتابوں کی تصنیف وتالیف (کیونکہ موجودہ کتب الحاد.اور دین سے دوری پیدا کرنے والے زہر قاتل سے بھری ہوئی ہیں) کی شدید احتیاج تھی نیز ایسے مدارس کے لئے یہ بھی ایک شدید ضرورت تھی کہ حکومت ان مدارس کی سندات کو باقاعدہ طور پر تسلیم کرلیتی۔ مگر صدافسوس کہ انگریزی سامراج کے دور حکومت میں مسلمانوں کو ان میں سے ایک سہولت بھی میسر نہ آسکی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس طرح کی کوششیں بار آور نہ ہوسکیں اس لئے ہندوستان کے علماء کو خالص دینی مدارس کی ترویج وترقی اور اپنے پرانے طریقے کی بقاء کی کوششوں پر مجبور ہونا پڑا۔

بلاشبہ خالص دینی مدارس نے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کیلئے عظیم خدمات انجام دی ہیں۔ انگریزوں کی خواہش کے برخلاف اور اس راہ میں پیش آمدہ مشکلات کے باوجود بے شمار ایسے اکابر علماء پیدا کئے جنھوں نے اپنی وسعت علمی.تقوی. تمام دینی موضوعات پر بے شمار تالیفات کیں. پرچم اسلام کی سربلندی کیلئے خود کو فنا کردیئے اور کتاب وسنت کو مضبوطی سے تھامے رکھنے اور

اللہ ورسول اور مؤمنین کے ساتھ غایت درجہ محبت رکھنے میں متقدمین اسلاف کی یاد تازہ کردی۔

ان دینی مدارس کے پیش نظر اگرچہ بنیادی مقصد علوم اسلامیہ کو اسی طرح جوں کا توں محفوظ رکھنا تھا کہ وہ اب تک موجود چلے آئے تھے۔ مگر پھر بھی ان مدارس سے فارغ التحصیل ہونیوالے افراد اپنے اسی بنیادی مقصد پر اکتفاء کر کے نہیں بیٹھ رہے۔ بلکہ بیشتر حضرات نے جدید نظریات سے اس غرض سے مکمل دسترس حاصل کرلی تاکہ ان کا رد پیش کر کے ان شبہات کا ازالہ کر دیا جائے جن کو یہ باطل نظریات اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اچھالتے رہتے تھے۔

دینی مدارس نے علوم دینیہ کی بقاء واشاعت۔ دین پر ہونیوالے علمی حملوں کا مکمل دفاع اور جہد مسلسل اور مسلم عوام کی دینی تربیت کی خاطر اس دور میں اپنے تمام تر وسائل اور صلاحتیں صرف کر ڈالیں۔ یہاں کے فارغ التحصیل علماء نے دینی موضوعات پر ہندوستان کی تقریباً ہر زبان میں بے شمار کتابیں تصنیف کر کے۔ اپنے خطبوں اور وعظوں کے ذریعہ تمام خطوں کے گلی کوچوں میں۔ جامع مساجد۔ عوام کی منعقدہ تبلیغی مجالس اور دوسرے علمی مباحث کے لئے مختلف تبلیغی وفود کے ذریعہ ان باطل نظریات کا مکمل علمی انسداد کردیا۔ الحمدللہ۔

قیام پاکستان کے بعد

یہ تو تھی برصغیر ہند کی انگریزی سامراج کے چنگل سے آزادی اور ایک ایسی آزاد اسلامی مملکت ـــــــ جو کہ قدیم وجدید دونوں نظامہائے تعلیم کو یکجا کر کے خالص دینی بنیادوں پر ایک ایسا نظام تعلیم مرتب کر سکے جس میں دین و دنیا، دونوں کے علوم متناسب مقدار میں جمع کر دیا جائے ـــــــ کے قیام تک ہندوستان کے دینی مدارس کی حالت قیام پاکستان کے بعد علماء کو توقع تھی کہ ایک جدید ترین نظام تعلیم یقیناً مرتب کرلیا جائیگا۔ مگر صد افسوس یہ ہوا کہ پاکستان اپنے قیام کے اول روز سے ہی مسلسل سیاسی بحرانوں اور شدید اقتصادی مشکلات میں گھرا رہا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی کو یہ مہلت ہی نہ مل سکی کہ جدید وقدیم نظام تعلیم کو یکجا کر کے ایک متفقہ جدید نظام تعلیم ترتیب دیا جاسکتا۔ چنانچہ دینی مدارس میں آج بھی وہی نظام تعلیم معمولی تغیر کے ساتھ رائج ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کے ہاں رائج چلا آ رہا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں آج بھی دو متوازی نظام تعلیم رائج ہیں۔ ایک تو وہ نظام ہے جو سرکاری اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں رائج ہے۔ جس میں دین کی بعض بنیادی باتوں کی زیادتی کر کے خالصۃً جدید علوم کی تعلیم دیجاتی ہے۔ اور دوسرا ان قدیم طرز کے دینی مدارس میں جاری

ہے جس میں معمولی ترمیمات کے ساتھ درس نظامی ہی کو پڑھایا جاتا ہے۔
ذیل میں دینی مدارس کے بارے میں کچھ ضروری معلومات پیش کی جاتی ہیں :۔

پاکستان میں دینی مدارس

۱۳۹۲ھ کے جائزہ کے مطابق پاکستان میں دینی مدارس کے مجموعی تعداد تقریباً آٹھ سو ترانوے (۸۹۳) ہے پاکستان میں صوبہ وار دینی مدارس، اساتذہ اور طلباء کی تعداد کا اندازہ ذیل کے نقشہ سے لگایا جاسکتا ہے :۔

صوبہ	تعداد مدارس	تعداد اساتذہ	تعداد پاکستانی طلباء	غیر ملکی طلباء	کل تعداد طلباء
پنجاب	۵۸۰	۱۴۹۵	۲۸۵۹۳	۵۰۲	۲۹۰۹۵
سندھ	۷۲	۳۱۸	۵۲۴۳	۱۸۸	۵۴۳۱
شمالی مغربی سرحدی	۱۰۴	۴۴۵	۸۵۹۰	۹۱۶	۹۵۰۶
صوبہ بلوچستان	۲۳	۷۳	۱۲۰۷	×	۱۲۰۷
وہ مدارس جن کے اعداد وشمار حاصل نہیں ہوسکے	۱۱۴	×	×	×	×
مجموعی تعداد	۸۹۳	۲۳۳۱	۴۳۶۳۳	۱،۶۰۶	۴۵۲۳۹

آمدنی کے ذرائع

دینی مدارس کے تمام تر اخراجات مسلمانوں کے عطیات سے پورے کئے جاتے ہیں، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ حکومت کی طرف سے کسی قسم کا تعاون قبول نہیں کیا جاتا۔ ۱۳۹۲ھ کے اعداد وشمار کے مطابق ان مدارس کے مجموعی اخراجات کا تخمینہ (۸۱،۵۷،۷۰۶) اکیاسی لاکھ ستاون ہزار سات سو چھ روپے کے لگ بھگ تھا، حیران کن بات یہ ہے کہ اگر ان مصارف کو طلباء کی کل تعداد

تقسیم کیا جائے تو ایک طالب علم پر تعلیمی اخراجات صرف ایک سو اسی روپے سالانہ بنتے ہیں۔ اور اس قدر قلیل مقدار پر گزارہ کرنا انسانی عقل کو حیرت زدہ کر دیتا ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ دینی مدارس کے اساتذہ اور طلباء نے زندگی کے ہر شعبہ میں سادگی کو اپنا رکھا ہے، جسکی وجہ سے وہ قلیل آمدنی پر ہی قناعت کر لیتے ہیں لیکن توسع دنیوی کے پیچھے اپنی صلاحیتوں کو برباد نہیں ہونے دیتے۔

نصاب تعلیم

ان دینی مدارس میں ابتداءً پرائمری تعلیم کے معیار تک کے طلباء کو داخلہ دیا جاتا ہے اس طرح یہ طلباء مروجہ سرکاری یا پرائیویٹ اسکولوں میں کم از کم چار سال تعلیم حاصل کر چکے ہوتے ہیں پھر یہاں پر ان طلباء کو آٹھ سال میں، بعض جزوی ترمیمات کے ساتھ مکمل درس نظامی کی تعلیم دیجاتی ہے درس نظامی سے فراغت کے بعد طالب علم کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو " درجات تخصص میں داخلہ لے سکتا ہے۔ بعض بڑے مدرسوں نے ان درجات تخصص کا انتظام کر رکھا ہے۔ طالب علم تفسیر وحدیث، فقہ وافتاء، یا دعوت وارشاد میں سے کسی ایک مضمون میں "تخصص" کر سکتا ہے، ان موضوعات میں سے ہر ایک میں تخصص کے لئے دو دو سال کی مدت متعین کی گئی ہے۔

ان دینی مدارس کے طلباء تحصیل علم کے بعد مختلف مشاغل اختیار کر لیتے ہیں، مثلاً:۔

○ ____ دینی یا سرکاری اداروں میں دین اور علوم دین کی تدریس۔

○ ____ افتاء اور تصنیف وتالیف۔

○ ____ مساجد میں خطابت وامامت۔

○ ____ بعض علاقوں میں شرعی عدالتیں موجود ہیں، وہاں پر قاضی (جج) مقرر ہو جاتے ہیں۔

○ ____ رسائل اور جرائد کی ادارت وانتظامات۔

غرضیکہ اپنے اپنے ذوق اور علمی صلاحیتوں کے مطابق ہر شخص کسی نہ کسی دینی خدمت میں مصروف ہو جاتا ہے۔

طریقہ تعلیم

دینی مدارس میں طریقہ تعلیم کی خصوصیت یہ ہے کہ طالب علم اپنے سامنے کتاب کھولے رکھتا ہے، روزانہ استاد کسی ایک طالب علم کو اس کتاب کا کچھ حصہ پڑھنے کا حکم دیتا ہے، طالبعلم پڑھتا ہے اور استاذ اور دوسرے طلباء سنتے ہیں۔ اس دوران پڑھنے والے سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو اسکی اصلاح بھی کرتے جاتے ہیں۔ جب طالب علم عبارت پڑھ لیتا ہے تو استاذ صاحب اس عبارت کے مضمون پر تشریحی تقریر کرنا شروع کرتے ہیں۔ جسے طلباء سنتے رہتے ہیں۔ اور جو لکھنا چاہتا ہے لکھتا رہتا ہے۔ پھر استاذ صاحب کتاب کی اسی عبارت کو دوبارہ پڑھنا شروع کرتے ہیں اور اپنی تشریحی تقریر کے ساتھ اسکی مطابقت کرتے جاتے ہیں۔ جس میں بوقت ضرورت کتاب کے مئولف پر تنقید بھی ہوتی ہے۔ پھر اس سبق سے متعلق استاذ صاحب طلباء کو سوالات کے ذریعہ اپنے اشکالات حل کرنے کا وقت دیتے ہیں۔ چنانچہ طلباء اپنے اعتراضات وسوالات پیش کرتے ہیں اور استاذ صاحب ان اشکالات کے جو ان کے اذہان کے اعتبار سے مشکل تھے، یا ان کو سمجھنے میں دشواری پیش آتی تھی وضاحت کے ساتھ جواب دیتے جاتے ہیں نیز اپنی تشریحی تقریر پر ہونیوالے اعتراضات کا جواب دیتے ہیں ——— غرضیکہ ہر سبق اس طرح اختتام پذیر ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ہر طالب علم کے لئے آئندہ پڑھنے والے سبق کا مطالعہ اور پڑھے ہوئے سبق کا اعادہ انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ اسباق ختم ہوتے ہی طلباء چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ہر ٹولی اپنے میں سے ایک قابل طالب علم کو چن لیتی ہے جو گزشتہ پڑھے ہوئے اسباق کا مذاکرہ کراتا ہے۔ وہ تقریر کرتا ہے اور باقی طلباء سنتے ہیں، جو بات کسی کو سمجھ میں نہ آئے اسے بار بار پوچھتے ہیں۔ اور بسا اوقات یہ سننے والے طلباء پڑھنے والے کی غلطی پر متنبہ کر کے اس کی درستگی کر دیتے ہیں۔

مکمل تعلیمی زندگی کے دوران یونہی تعلیم جاری رہتی ہے۔

دینی مدارس کی تنظیم کا مسئلہ

پاکستان کے تمام مدارس نصاب تعلیم میں اگرچہ باہم متفق ہیں مگر انتظامی امور میں ایک دوسرے سے کلی طور پر جدا ہیں۔ ہر مدرسہ تنظیمی اور تعلیمی لحاظ سے اپنی جگہ ایسی مستقل حیثیت رکھتا ہے کہ باہم

ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

ارباب مدارس دینیہ کو امتحانات میں یکجائی۔ نظام تعلیم اور نصاب تعلیم میں اصلاح اور حالات کے مطابق طریقہ تعلیم میں یگانگت پیدا کرنے کا احساس ہوا، چنانچہ ۱۳۷۸ھ کے بعد اس غرض سے کئی ایک تنظیمیں منظر عام پر آئیں۔ جن میں "وفاق المدارس العربیہ پاکستان" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ حنفی مسلک کے مدارس کی تنظیم ہے۔ جس کے ساتھ تقریباً ایک سو اکہتر (۱۷۱) مدارس منسلک ہیں۔ "وفاق المدارس نے دورہ حدیث شریف کے سالانہ امتحانات اور ملحقہ تمام مدارس میں نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کی یکجائی کا اہتمام" کیا۔ اور اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب رہا۔

ان مدارس کے نظام تعلیم کی بنیاد و اساس درس نظامی ہی ہے البتہ زمان و مکان کی ضرورتوں کے پیش نظر اس نصاب کی بعض کتب میں کمی بیشی ہو گئی ہے۔ مثلاً بعض بڑے مدارس میں منطق، فلسفہ اور دیگر ہیئت کی بہت سی کتب کے علاوہ علوم عربیہ کی بعض قدیم کتب کو نصاب سے خارج کر کے "النحو الواضح" اور البلاغۃ الواضحہ" عربی علوم میں "تسہیل الوصول الی علم الاصول" اصول فقہ میں "الحصول الحمیدیہ، الرسالۃ الحمیدیہ اور "الانتباہات المفیدہ فی حل المشکلات الجدیدہ" علم کلام میں اضافہ کر دیا گیا۔

دینی مدارس اور علوم جدیدہ

پاکستان کے بڑے دینی مدارس نصاب تعلیم میں بعض جدید علوم کے اضافہ کی شدت سے ضرورت محسوس کرنے لگے ہیں۔ لیکن دینی مدارس کے علمی ذوق کے علی الرغم ان علوم جدیدہ کے موجودہ انداز کو اپنا لینے کو قطعاً گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس حد تک اس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جا سکتا ہے جس حد تک یہ علوم جدیدہ علماء کرام کو دعوت الی اللہ تبلیغ اسلام اور اسلام پر ہونے والے اعتراضات و شبہات کا رد کرنے میں معاون ثابت ہو سکیں۔ چنانچہ بعض مدارس نے انگریزی زبان، جدید معاشیات اور سیاست و قانون کو کسی حد تک نصاب تعلیم میں شامل کر لیا ہے۔ اور ایسے مدارس کی تعداد کوئی خاص قابل ذکر نہیں ہے۔ جس کا بڑا سبب وسائل اور جدید و قدیم علوم میں بیک وقت نظر رکھنے والے افراد کے فقدان اور دیگر بے شمار مشکلات کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر مدارس اپنے قدیم طرز پر ہی چل رہے ہیں، اور جدید علوم کی صحیح تعلیم کا بندوبست انکے لئے تقریباً ناممکن ہو کر رہ گیا ہے۔ اور مذکورہ ذیل اسباب کو ہم اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دے سکتے ہیں:۔

۱۔ علوم جدیدہ کی تعلیم و تدریس بہت زیادہ مادی وسائل کی محتاج ہے اور ان وسائل کا حصول ان مدارس کے بس سے باہر ہے۔

۲۔ دینی مدارس کا بنیادی مقصد صرف علوم دینیہ کی تعلیم و تدریس ہی نہیں ہے بلکہ خالص دینی مزاج کی آبیاری، طلباء کے عمل کی خالص دینی بنیادوں پر تربیت، اتباع سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ کے طریقے کو عملی زندگی کے ہر میدان میں ـــــ حتی کہ شکل و صورت میں بھی ـــــ اسلام کے نقش قدم پر چلانا ہوتا ہے۔

لیکن دوسری جانب علوم جدیدہ کے بڑے بڑے پروفیسروں کے ہاں ان باتوں کا وہ اہتمام نہیں کیا جاتا جس کی طرف دینی مدارس میں خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ مدارس اس بات سے خوفزدہ ہو جاتے ہیں کہ کہیں خدانخواستہ علوم جدیدہ کے یہ اساتذہ مدارس کے مزاج اور پختہ دینی ذوق کو بگاڑنے اور متغیر کرنے کا سبب تو نہ بن جائیں گے اور نہیں تو کم از کم اس میں معاون ضرور ثابت ہوں گے۔

۳۔ علوم جدیدہ فی نفسہا دین اور علوم دینیہ کے مخالف نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ اس کے مرتبین بڑے بڑے غیر مسلم ہیں اور انہوں نے ان علوم کو اس انداز سے ترتیب دیا ہے کہ لازماً طلباء کے دلوں میں دین اور اس کے اجماعی راویوں کے خلاف شکوک و شبہات کے بیج بو دیئے جاتے ہیں، اور اس مشکل کا واحد حل یہی ہے کہ یا تو ان علوم کی کتابوں کو از سر نو مرتب کیا جائے یا پھر ایسے ماہرین ان کو پڑھائیں جن کو اسلام اور اس کے علوم میں مہارت تامہ اور مکمل معرفت حاصل ہو۔ نیز دشمنوں کی مکاریوں اور ملحدین اور غیروں کی کتب میں فساد کی بنیادوں سے بھی مکمل طور پر واقف ہوں۔ اور ان دونوں امور کا حل مدارس دینیہ کے لئے انتہائی مشکل کام ہے۔

(ماہنامہ "البلاغ" جمادی الثانی ۱۳۹۷ھ ج ۱۱ ص ۳۵۳)

دینی مدارس کا نصاب و نظام

نقوشِ رفتگاں

عہدِ حاضر کی نابغۂ روزگار شخصیتوں کا اثر انگیز تذکرہ
جس میں ان کے اوصاف و کمالات اور ان کے ساتھ
گذرے ہوئے واقعات شامل ہیں۔
پُر تاثیر تحریر۔ تقریباً پون صدی کی علمی، ادبی،
سیاسی تاریخ کا جامع مرقع۔

جسٹس مُفتی محمد تقی عُثمانی صاحب

دینی مدارس کا نصاب ونظام

آئندہ جمادی الثانیہ کے وسط میں وفاق المدارس العربیہ کا ایک اجلاس دینی مدارس کے نصاب پر غور کرنے کے لئے منعقد ہو رہا ہے۔ گزشتہ سال شعبان میں وفاق کی ایک کمیٹی نے نصاب پر نظر ثانی کر کے ایک سولہ سالہ نصاب تجویز کیا تھا جس پر سال رواں کے آغاز سے بعض مدارس میں عمل شروع کر دیا گیا ہے۔ اس دوران متعدد مدارس کی طرف سے اس نصاب پر کچھ اشکالات بھی پیش کئے گئے، اس اجلاس کا مقصد ان اشکالات کا، نیز جن مدارس نے اس سال اس نصاب پر عمل کیا ہے، ان کے عملی تجربات کا جائزہ لینا ہے، تاکہ آئندہ کوئی متفقہ لائحہ عمل تیار کیا جا سکے۔

دینی مدارس کے نصاب میں ترمیم واضافہ کی آوازیں مختلف حلقوں سے بار بار اٹھتی رہی ہیں، اور ہم نے "البلاغ" کے ان صفحات میں متعدد مرتبہ اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے، لیکن اس سے قبل جو کچھ عرض کیا گیا، اس کی حیثیت جزوی اور ضمنی سی تھی آج جبکہ دینی مدارس کا یہ نمائندہ اجتماع اس موضوع پر اصولی غور وفکر کیلئے منعقد ہو رہا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں قدرے تفصیل کے ساتھ اپنی گزارشات پیش کر دی جائیں۔ واللہ المستعان۔

جو لوگ دینی مدارس کے نظام سے براہ راست وابستہ نہیں ہیں، اور جن کی اس نظام تعلیم کا کوئی عملی تجربہ حاصل نہیں ہے، ان کی طرف سے بسا اوقات اس قسم کی تجویز سامنے آتی رہتی ہیں کہ ان مدارس کے نصاب میں سائنس، ریاضی اور انجینئرنگ وغیرہ کی معیاری تعلیم کا انتظام ہونا چاہئے، تاکہ جو علماء ان دینی مدارس سے فارغ التحصیل ہو کر نکلیں، وہ دینی علوم کے ساتھ ساتھ ان تجربی علوم میں بھی کماحقہ، درک اور بصیرت رکھتے ہوں۔

یہ تجویز خواہ کتنی نیک نیتی کے ساتھ پیش کی جاتی ہو لیکن نہایت سطحی تجویز ہے جو در حقیقت دینی مدارس کے مقاصد سے ناواقفیت پر مبنی ہے، واقعہ یہ ہے کہ دینی مدارس کا مقصد ایسے صاحب استعداد علماء پیدا کرنا ہے جو قرآن وسنت اور ان کے متعلقہ علوم میں ماہرانہ بصیرت کے حامل ہوں، اور یہ مقصد

جس ذہنی یکسوئی اور ہمہ تن توجہ کا متقاضی ہے، اس کی موجودگی میں یہ بات قریب قریب ناممکن ہے کہ ایک شخص بیک وقت اونچی استعداد کا حامل عالم دین بھی ہو، اور ساتھ ساتھ ماہر ڈاکٹر، سائنسداں یا ماہر معاشیات بھی ہو۔

یہ بات یوں تو ہر دور میں سچ تھی، لیکن آج کا زمانہ، جسے ہر علم وفن میں اختصاص کا دور کہا جاتا ہے، اس میں تو روز روشن کی طرح واضح ہو گئی ہے۔ آج اگر کوئی شخص علم طب کو اپنا خصوصی موضوع بناتا ہے، اور میڈیکل سائنس میں مہارت حاصل کرتا ہے تو کوئی بھی صاحب عقل اس پر یہ اعتراض نہیں کر سکتا کہ وہ ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ انجینئر کیوں نہیں بنے؟ یا اگر کوئی شخص انجینئرنگ کے شعبے میں فارغ التحصیل ہوتا ہے تو اس پر کوئی ہوش مند یہ اعتراض نہیں کرتا کہ اس نے میڈیکل سائنس کیوں نہیں پڑھی؟

اس طرح اگر کسی سائنسی تعلیم کے ادارے میں تمام تر توجہ سائنس کی تعلیم پر دی جاتی ہے تو کوئی شخص وہاں یہ اعتراض پیش نہیں کرتا کہ اس ادارے میں ادب، شاعری، یا کامرس کی تعلیم کیوں نہیں ہوتی؟ کسی کامرس کالج پر یہ اعتراض کبھی نہیں کیا جاتا کہ یہاں سے انجینئر کیوں پیدا نہیں ہوتے؟ کسی لاء کالج کے بارے میں کبھی یہ تجویز نہیں سنی گئی کہ اس میں فلکیات کی تعلیم بھی ہونی چاہئے۔

سوال یہ ہے کہ اگر دینی مدارس کی تمام تر توجہ اسلامی علوم کے ماہرین پیدا کرنے پر مرکوز ہے، اور وہاں سے کوئی ڈاکٹر، انجینئر، سائنس داں یا ماہر معاشیات پیدا نہیں ہوتا تو اس بات پر اس قدر تشویش اور واویلا کیوں ہے؟ کیا تفسیر، حدیث، فقہ، کلام اور ان کے متعلقات ایسے علوم نہیں ہیں کہ ان کے درس و تدریس کے لئے کچھ ادارے مخصوص ہوں، جو ہمیں انہی علوم پر محنت کر کے انہی کی خدمت انجام دیں، اور انہی علوم کے متخصص علماء پیدا کریں؟ اگر کوئی شخص واقعۃً ایسا سمجھتا ہے تو اس کی ناواقفیت پر اظہار افسوس کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے؟ لیکن اگر کوئی شخص ان علوم کی اہمیت اور عظمت کا کسی بھی درجے میں احساس رکھتا ہے تو اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ علماء دین سے انجینئر اور سائنس داں بننے کا مطالبہ کس قدر سطحی، غیر حقیقت پسندانہ اور ناقابل عمل ہے۔

بعض حضرات دینی مدارس کی خیر خواہی اور ہمدردی میں یہ تجویز بھی پیش فرماتے رہے ہیں کہ ان درسگاہوں میں دستکاری کے ہنر سکھانے اور دوسری ٹیکنیکی تربیت کا بھی انتظام ہونا چاہئے، تاکہ جو علماء یہاں سے فارغ التحصیل ہوں، وہ معاشی اعتبار سے معاشرے پر بوجھ بننے اور دوسروں کے دست نگر ہونے کے بجائے اپنے معاش کا انتظام اپنے ہاتھ کے ہنر سے کر سکیں، اور دین کی خدمت کسی معاوضے کے بغیر انجام دیں۔

یہ تجویز، خواہ کتنی نیک نیتی سے پیش کی گئی ہو، اور بظاہر کتنی خوش نما معلوم ہوتی ہو، حقیقت پسندی سے بہت دور اور ناقابل عمل ہے ـــــــ پہلی بات تو وہی ہے کہ اگر دینی مدارس کا مقصد قرآن وسنت کے علوم میں بصیرت رکھنے والے علماء پیدا کرنا ہے تو یہ علوم اپنی تحصیل اور اپنی خدمت کے لئے پورا وقت چاہتے ہیں، اور آج کی زندگی جس قدر پیچیدہ ہو گئی ہے، اس میں تجربہ یہی ہے کہ ٹیکنیکی کاموں میں لگ جانے کے بعد ان علوم کی خدمت محض ایک آرزو، ہو کر رہ جاتی ہے جو ساری عمر پوری نہیں ہوتی، بعض طلباء نے علم دین کے ساتھ ساتھ یہ ٹیکنیکی ہنر سیکھے، لیکن اس عملی تجربے میں شاید کوئی استثناء نہ ہو کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اگر طالب علم دینی علوم کی خدمت میں لگا تو اپنے ہنر کی طرف توجہ نہ دے سکا، اور اس ہنر کے ذریعے کسب معاش میں مصروف ہوا تو علوم دین سے تعلق باقی نہ رکھ سکا۔ لہٰذا جو مدارس اعلیٰ قابلیت کے علماء تیار کرنے کے لئے قائم ہوئے ہیں ان کے لئے یہ نہ ممکن ہے، اور نہ مناسب، کہ وہ اپنے طلباء کو علوم دین کے ساتھ ٹیکنیکی تربیت دینے کا بھی انتظام کریں۔

دوسرے یہ عجیب تصور ہے کہ اگر کوئی شخص معاشرے کی دینی ضرویات پوری کر کے کوئی اجرت یا تنخواہ وصول کر رہا ہے تو وہ "معاشرے پر بوجھ" یا "دوسروں کا دست نگر" بن گیا ہے، علم وفن کے ہر شعبے کا قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص علم وفن میں مہارت حاصل کر کے اس شعبے میں معاشرے کی خدمت انجام دیتا ہے، اس کا معاش بھی اسی شعبے سے وابستہ ہوتا ہے، اور اگر وہ اس شعبے میں معاشرے کی خدمت انجام دینے کی بناء پر کوئی اجرت یا تنخواہ وصول کرتا ہے تو اس میں معاشرے پر بوجھ بننے یا کسی کا دست نگر ہونے کا کوئی سوال نہیں، بلکہ یہ اس معاشرتی نظام کا ایک لازمی حصہ ہے جس پر پوری انسانیت کی بنیاد قائم ہے، اگر کوئی طبیب، انجینئر، ماہر معاشیات، یا سائنس داں اپنے شعبے میں معاشرے کی خدمت کرتا ہے، اور اس کے صلے میں معاشرہ اسے معاشی فوائد بہم پہونچاتا ہے تو نہ یہ اس پر کسی کا احسان ہے، اور نہ اس کی بناء پر یہ سمجھنا درست ہے کہ وہ معاشرے پر بوجھ بن رہا ہے، یا دوسروں کا دست نگر ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا علوم دین کی خدمت معاشرے کی کوئی ضرورت نہیں؟ کیا ایک مسلمان معاشرے کو ایسے اہل علم کی حاجت نہیں جو ان کی دینی ضروریات پوری کر سکیں؟ ان کو نت نئے مسائل میں دین کی رہنمائی فراہم کر سکیں؟ ان کے بچوں کو دینی تعلیم دے سکیں؟ ان کے دینی مستقبل کے تحفظ کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر سکیں؟ دین پر حملہ آور فتنوں کا موثر تعاقب کر سکیں؟ اور دین سے متعلق وہ تمام امور انجام دے سکیں، جو دوسرے کاموں میں مشغول افراد انجام دے سکتے۔

اگر یہ ایک مسلمان معاشرے کی اولین ضرورت ہے، اور کون ہے جو اس حقیقت کا انکار

کر سکے ؟ تو اگر معاشرہ ان خدمات کے صلے میں ایسے اہل علم کو اپنے معاش سے بے فکر کرنے کیلئے اپنا فریضہ ادا کرتا ہے تو کونسا احسان ہے، جو ان اہل علم پر کیا جارہا ہے ؟ اور اس کی بناء پر یہ خیال آخر کیوں پیدا ہوتا ہے کہ وہ معاشرے پر بوجھ اور دوسروں کے دست نگر ہیں ؟ اس لئے انھیں اپنی معاشی کفالت کیلئے کوئی اور ہنر سیکھنا چاہئے۔

بعض حضرات دینی مدارس کے نصاب و نظام میں ترمیم کے اس بناء پر خواہش مند رہتے ہیں کہ ان مدارس کی سند دنیا کی دوسری یونیورسٹیوں میں تسلیم کرلی جائے، اور یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ کو ان یونیورسٹیوں میں داخلہ مل سکے، یا ان سندوں کے حامل طلبہ کو سرکاری اداروں وغیرہ ملازمتیں مل سکیں، اور چونکہ دوسری یونیورسٹیوں کے ساتھ معادلہ مدارس کے نصاب و نظام میں تبدیلی کئے بغیر ممکن نہیں نظر آتا، اس لئے وہ اس نظام میں ترمیم کی خواہش رکھتے ہیں۔

ہماری نظر میں یہ طرز فکر بھی درست نہیں، ہمارے نزدیک دینی مدارس کے نصاب و نظام پر خالصۃً اس نقطہ نظر سے غور ہونا چاہئے کہ ایک با استعداد اور صاحب بصیرت عالم دین کی حقیقی ضروریات کیا ہیں ؟ اور وہ کس طرح پوری ہو سکتی ہیں ؟ اس نقطہ نظر سے نصاب و نظام میں جن ترمیمات کی ضرورت ہو، ان کو بیشک اختیار کیا جائے، لیکن محض اس بنا پر ان مدارس کے مزاج و مذاق سے ہٹ کر کوئی تبدیلی کرنا ان کی سند دوسری یونیورسٹیوں یا سرکاری اداروں میں مقبول ہو جائے، ان دینی درسگاہوں کی بنیادی روح کے منافی ہے۔

دینی مدارس کی بنیاد جس اخلاص، للہیت، ایثار اور جذبہ خدمت دین پر رکھی گئی تھی اس میں اس بات سے کبھی کوئی بحث نہیں کی گئی کہ ان کی سندیں بازار میں کیا قیمت رکھیں گی ؟ اکابر علمائے دیوبند میں سے کتنے حضرات تھے، جنھوں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد کبھی سند لی ہی نہیں، اس کے بجائے اصل مسئلہ یہ تھا کہ یہاں کے فارغ التحصیل علماء میں دینی علوم کی اعلیٰ مہارت، اتباع سنت کا جذبہ خشیت و تقویٰ، انابت الی اللہ اور جذبہ خدمت دین کس طرح پیدا ہو ؟

اور واقعہ یہ ہے کہ دینی مدارس اگر اپنے مطلوبہ معیار کے مطابق کام کریں، اور ان سے اسی صلاحیت کے اہل علم پیدا ہوں جس صلاحیت کے علماء کی ضرورت ہے، اور جس کی آبیاری ان مدارس کا بنیادی مقصود ہے، تو اس بات کی ضرورت ہی باقی نہ رہے کہ یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ دوسری یونیورسٹیوں میں "اعلیٰ تعلیم" حاصل کرنے کے محتاج ہوں، یا سرکاری اداروں میں اپنی اسناد منظور کرانے کی درخواستیں لئے پھریں۔ اسکے بجائے ان مدارس کو خود اپنا تعلیمی اور تربیتی معیار بلند کرنے کی فکر کرنی چاہئے، اور یقین ہے کہ اگر مطلوبہ معیار حاصل ہو گیا تو تمام دوسرے ادارے چار و ناچار ان کی

سند کو تسلیم کرنے پر از خود مجبور ہوں گے۔

ہمارے دینی مدارس جس علم کے امین اور جس مزاج ومذاق کے وارث ہیں، اس میں یہ بات ان کے لئے عار ہے کہ وہ دوسروں سے اپنی علمی استعداد کی شہادت حاصل کرنے کے لئے درخواستیں، اپیلیں یا مطالبے کرتے پھریں۔ اس علم کا مزاج تو یہ ہے کہ اپنے حصے کا کام ٹھیک انجام دینے کے بعد انسان اپنی دھن میں لگ جائے، کسی کو ہزار مرتبہ ضرورت پڑے تو وہ اپنی غرض اور اپنی ضرورت سے اس کی طرف رجوع کرے ورنہ اس کو اپنی علمیت منوانے کی چنداں حاجت نہیں۔ اور ماضی کا تجربہ بھی یہی بتاتا ہے کہ جن حضرات نے ان مدارس میں رہ کر علمی اور عملی کمال حاصل کر لیا، ان کو کبھی کہیں اپنی سند دکھانے کی ضرورت نہیں پڑی، اور ان کی خدمات کے طلبگار صرف دینی مدارس ہی میں نہیں، بلکہ اعلیٰ یونیورسٹیوں سے لیکر سرکاری اداروں تک اتنے رہے ہیں کہ انکو کبھی ناقدری کا شکوہ نہیں ہوا۔

لیکن یہ سب کچھ اسی وقت ہوا جب انھوں نے اپنے آپ کو پورے اخلاص کے ساتھ زیور علم سے آراستہ کیا، اور صرف نام کے فارغ التحصیل ہونے کے بجائے واقعتہً علوم دین کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔ انہوں نے دنیا طلبی کیلئے علم حاصل نہیں کیا، بلکہ خدمت دین کو اپنا مشن بنایا، لیکن عملاً یہ ہوا کہ دنیا بھی ان کے قدموں میں ذلیل وخوار ہو کر پہنچی اور معاشی اعتبار سے وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے۔

لہٰذا محض اپنی سند کو تسلیم کرانے کی خاطر دینی مدارس کے نصاب ونظام میں کوئی ایسی تبدیلی کرنا جو ان کے مزاج ومذاق سے ہٹی ہوئی ہو، ان مدارس کی روح کے یکسر منافی ہے۔

ان گزارشات کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم دینی مدارس کے موجودہ نصاب ونظام میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس نصاب ونظام میں ترمیم واضافہ پر غور کرنے سے پہلے ہمیں وہ مقصد متعین کرنا چاہئے جس کے تحت ہم ترمیم واضافہ چاہتے ہیں۔ اگر مقصد ان تین باتوں میں سے کوئی ایک ہے جن کا اوپر ذکر کیا گیا تو ہم اس مقصد کے تحت کسی ترمیم کی نہ صرف یہ کہ ضرورت نہیں سمجھتے، بلکہ اس کے شدت کے ساتھ مخالف ہیں۔

ہاں اگر نصاب ونظام پر نظر ثانی کا مقصد یہ ہے کہ ان مدارس سے فارغ ہونیوالے حضرات ایک عالم دین کی حیثیت میں زیادہ ٹھوس اور مستحکم استعداد کے حامل ہوں، اور زیادہ موثر اور زیادہ وسیع دینی خدمات انجام دے سکیں تو ایسی نظر ثانی ہماری نظر میں نہ صرف قابل خیر مقدم، بلکہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے، لیکن اس کے لئے ذہن کو مذکورہ تین مقاصد کے تحفظات سے خالی کر کے

خالصۃً: اس نقطہ نظر سے غور کرنا ہوگا کہ ایک عالم دین کی حقیقی ضروریات کیا ہیں؟ وہ موجودہ نصاب ونظام سے پوری ہو رہی ہیں یا نہیں؟ اگر وہ پوری نہیں ہو رہیں تو اس کے کیا اسباب ہیں؟ اور ان اسباب کو دور کر کے کس طرح مطلوبہ معیار حاصل کیا جاسکتا ہے؟

اس ناقابل انکار حقیقت پر دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں کہ دینی مدارس کا علمی اور عملی معیار مسلسل انحطاط کا شکار ہے، اور ان کی پیداوار اپنی صفات اور کیفیت کے لحاظ سے روز بروز روبہ زوال ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے طلباء کی ایک بہت بڑی تعداد وہ فرائض خاطر خواہ طور پر انجام دینے سے قاصر رہتی ہے جو بحیثیت عالم دین اس پر عائد ہوتے ہیں۔ دوسری طرف جس رفتار سے پوری دنیا میں اچھی استعداد اور اعلیٰ کردار کے حامل علماء کرام کی ضرورت بڑھ رہی ہے، اتنا ہی ہمارے دینی مدارس کے فارغ التحصیل علماء کا دائرہ اثر ونفوذ روز بروز سمٹ رہا ہے۔ اس بات کا اعتراف نہ کرنا حقیقت ناشناسی کے مرادف ہوگا کہ پہلے ایک عالم دین کی بات معاشرے میں جس وزن اور جس تاثیر کی حامل ہوتی تھی، اور اس کو جس قدر وسیع قبولیت عامہ حاصل ہوتی تھی، اب اس صورت حال میں بڑی تیزی کے سات فرق آرہا ہے۔ اس کا ایک سبب بلاشبہ یہ بھی ہے کہ ذہنوں پر مادیت کا غلبہ پہلے سے زیادہ ہوگیا، اور بحیثیت مجموعی لوگوں کے افکار واعمال پر دین کی گرفت ہی ڈھیلی پڑگئی ہے، لیکن اس کا ایک بہت بڑا سبب خود ہمارے اپنے نقائص بھی ہیں، اور جب تک ان نقائص کا کھلے دل اور وسیع حوصلے کے ساتھ جائزہ لیکر ان کے ازالے کی کوشش نہیں کی جائیگی، اس سنگین اور تشویش ناک صورت حال میں تبدیلی لانا بہت مشکل ہے۔

اس جائزے کے بہت سے پہلو ہیں، لیکن اگر ان سب پر گفتگو کی جائے تو بات کے موضوع سے دور نکل جانے کا اندیشہ ہے، اس لئے فی الحال ہم گفتگو کو صرف دینی مدارس کے نصاب ونظام کی حد تک محدود رکھتے ہوئے ان اسباب کا مختصراً جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں جن کی وجہ سے دینی مدارس کا مطلوبہ معیار گھٹ رہا ہے، اور ان کی افادیت محدود ہو رہی ہے۔ ہماری گفتگو دینی مدارس کے مزاج ومذاق، ان کے نصاب، ان کے طریق تدریس اور ان کے ماحول سے متعلق چار حصوں پر منقسم ہوگی، واللہ سبحان الموفق۔

برصغیر کے دینی مدارس کے سب سے قیمتی سب سے گرانقدر اور سب سے اہم پونجی ان کا وہ مزاج ومذاق ہے جو انھیں اپنے اللہ والے اکابر سے ورثے میں ملا ہے۔ آج ہمارے دینی مدارس بنیادی طور پر دارالعلوم دیوبند کے خوشہ چین اور اسی کے نقش قدم پر چلنے کے خواہش مند ہیں۔ اور دارالعلوم دیوبند

کی بنیادی خصوصیت جو اسے دنیا کے دوسرے تعلیمی اداروں سے ممتاز کرتی ہے، وہ اس کے اکابر کے مزاج و مذاق ہے جس میں علم کے رسوخ، مطالعے کی وسعت اور استعداد کی پختگی کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ اہمیت اپنی زندگی، اپنے ذہن و فکر اور اپنے جذبات و خیالات غرض ہر چیز میں سنت کے اتباع، سلف صالحین کی پیروی، اللہ تعالیٰ سے رجوع، اس کی طرف انابت، اور اس کی رضا جوئی کی فکر کو حاصل تھی۔

دنیا میں مختلف علوم و فنون پر داد تحقیق دینے والوں کی کبھی کمی نہیں رہی، اور نرے "علم" کی حد تک تحقیق و تدقیق کی شناور دوسری معاصر درسگاہوں میں بھی بہت ہوئے ہیں لیکن دارالعلوم دیوبند کے نیو ہی علم و عمل کے سنگھم پر اٹھائی گئی تھی اور اس میں جس قدر توجہ طلبہ کی علمی صلاحیت بڑھانے کی طرف دی جاتی تھی، اس سے زیادہ ان کی عملی تربیت اور ان پر ادا میں اسلاف کا رنگ چڑھانے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ وہاں دلوں میں خوف و خشیت کی آبیاری ہوتی تھی، وہاں عبادت کا ذوق پروان چڑھایا جاتا تھا، وہاں حلال و حرام، بلکہ مکروہ و مستحب، اور اولیٰ اور خلاف اولیٰ کا صرف علم نہیں، بلکہ ان کی عملی فکر، اور ان کی اہمیت دلوں میں جاگزیں کی جاتی تھی، وہاں عبادات و طاعات کے علاوہ معاشرت معاملات اور اخلاق کو سنت کے مطابق ڈھالا جاتا تھا، وہاں ایثار، تواضع، تحمل، بردباری سادگی، اخلاص اور للہیت کے ملکات پیدا کئے جاتے تھے، وہاں ایک ایک فرد کے دل میں یہ بات بٹھادی جاتی تھی کہ علم برائے علم اس کا مطمح نظر نہیں، اور نہ تحصیل علم کا مقصد مال و جاہ کا حصول ہے، بلکہ اصل مقصد اپنے آپ کو اعلیٰ اسلامی اوصاف سے آراستہ کرنا اور اس کے بعد انہی اوصاف کو دوسروں تک منتقل کرنا ہے۔

چنانچہ دارالعلوم دیوبند کے اس دور میں، جب وہاں سے برصغیر، بلکہ عالم اسلام کی تاریخ ساز شخصیتیں پیدا ہوئیں، ہر ہر طالب علم کا یہ لازمی معمول تھا کہ وہ صرف کتابیں پڑھنے پر اکتفا کئے بجائے کسی نہ کسی مصلح یا مربی سے اصلاح و تربیت کا خصوصی تعلق قائم کرتا تھا، اور شاید ہی کوئی فارغ التحصیل طالب علم ایسا ہو جو فراغت کے فوراً بعد کسی نہ کسی مربی سے باقاعدہ رجوع نہ کرتا ہو، اور اس کی صحبت و تربیت سے صیقل ہوئے بغیر عملی میدان میں آجاتا ہو۔ آپ کو علماء دیوبند میں جتنی عظیم شخصیات نظر آئیں گی، وہ سب کسی نہ کسی شیخ کی تربیت یافتہ اور ان کی صحبت و خدمت سے فیض یاب تھیں۔

لیکن کچھ عرصے سے ہمارے دینی مدارس میں اس مزاج و مذاق کی بے حد کمی آگئی ہے، اب صرف کتاب کے پڑھنے پڑھانے ہی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا ہے، اور اصلاح اعمال و اخلاق کی طرف توجہ باقی نہیں رہی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خود مدارس کی عملی زندگی میں جائز و ناجائز اور مکروہ مستحب کی فکر رفتہ

رفتہ مفقود ہو رہی ہے۔ پہلے مدارس کے مہتممین اور اساتذہ کا یہ حال تھا کہ وہ مدرسہ کے پیسوں اور اس کی املاک کو پھونک پھونک کر استعمال کرتے تھے کہ کہیں حدود سے تجاویز نہ ہو جائے. ان کو اپنی آمدنی بڑھانے کے بجائے اس بات کی فکر دامن گیر رہتی تھی کہ جو تنخواہ ہم وصول کر رہے ہیں. وہ ہمارے لئے حلال بھی ہے یا نہیں اور اس کا حق ادا ہو رہا ہے یا نہیں؟ دار العلوم دیوبند کی تاریخ میں کتنی مثالیں ایسی ہیں کہ لوگوں نے اپنی تنخواہیں بڑھانے کی نہیں. کم کرنے یا کٹوانے کی درخواستیں دی ہیں۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب" سابق مہتمم دار العلوم دیوبند کی گائے ایک مرتبہ کسی نے مدرسے کے صحن میں لا کر باندھ دی. کسی شخص نے اس پر اعتراض کیا تو حضرت مولانا" اسکی جواب دہی کے بجائے وہ گائے ہی صدقہ کر دی. مظاہر علوم سہارنپور کے مہتمم حضرت مولانا عنایت الٰہی صاحب" مدرسہ کے سالانہ جلسہ کے موقع پر سینکڑوں افراد کے کھانے کا انتظام کرتے. لیکن خود کبھی مدرسے کے کھانے میں شریک نہ ہوتے. اور جب رات گئے انتظامات سے فارغ ہوتے تو اپنے گھر سے لایا ہوا ٹھنڈی سالن ایک کونے میں بیٹھ کر کھالیتے تھے۔ اسی مدرسے کے دوسرے مہتمم حضرت مولانا حافظ عبد اللطیف صاحب" کو کبھی مطبخ کی کارکردگی کے معائینے کے لئے کھانا چکھنا ہوتا تو پہلے ایک خوراک خریدتے. اور پھر چکھ کر باقی سالن واپس کر دیتے تھے۔

دار العلوم دیوبند کے اساتذہ. مہتممین اور طلبہ کی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہے ــــــــ لیکن جب آج ہم اپنا جائزہ لیتے ہیں تو بزرگوں کے اس طرز عمل کے ساتھ ساتھ کوئی دور کی نسبت بھی نظر نہیں آتی۔ غنیمت ہے کہ ابھی ظاہری وضع قطع اور کسی درجے میں عبادات واجبہ کی حد تک اتباع سنت کا کچھ اہتمام مدارس کے اندر باقی ہے. (اور بعض جگہ وہ بھی ختم ہو رہا ہے) لیکن اتباع سنت اور احتیاط و تقویٰ کسی ایک شعبے کی حد تک محدود نہیں. بلکہ وہ معاشرات. معاملات اور اخلاق ہر شعبہ زندگی پر حاوی ہے اور خاص طور پر ان شعبوں میں تدین تقویٰ اب ہمارے درمیان نایاب ہوتا جارہا ہے۔

کوئی مادہ پرست کہہ سکتا ہے کہ ان باتوں کا مدرسے کے مقاصد پورے ہونے اور اچھے طلبہ کی پیداوار سے کیا تعلق ہے؟ ــــــــ لیکن ہم. جو اکابر علماء دیوبند کے نام لیوا ہیں. ان باتوں کو مدرسے کی کامیابی اور ناکامی سے بے تعلق قرار نہیں دے سکتے۔ ان مدارس کی بنیاد اخلاص. للہیت اور تقویٰ پر ہے. اور اس بنیاد میں جتنی کمزوری آئے گی. اس پر کھڑی ہونیوالی عمارت. ظاہری اعتبار سے خواہ کتنی خوش نما ہو. لیکن نتائج و فوائد کے لحاظ سے اتنی ہی کمزور ہوگی۔

لہٰذا مدارس کی نصاب و نظام کا جائزہ لیتے وقت ہمارے نزدیک سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ اس کی روح کے احیاء کی فکر کی جائے۔ اس روح کی احیاء کا تعلق اصل میں تو اہل مدارس کی قلبی لگن سے

ہے، لیکن اس سلسلے میں چند عملی تجاویز درج ذیل ہیں:۔

(۱) تمام مدارس میں تصوف واحسان کو باضابطہ نصاب کا جزء بنایا جائے۔

(۲) اساتذہ وطلبہ پر لازم کیا جائے کہ وہ ہفتے میں کم از کم ایک مرتبہ جمع ہو کر بزرگان دین اور بالخصوص اکابر علمائے دیوبند کے حالات وملفوظات کا اجتماعی طور پر مطالعہ کریں۔ اس میں حضرت تھانوی قدس سرہ کی ارواح ثلاثہ، تذکرۃ الرشید، حیات قاسمی، تذکرۃ الخلیل، حیات شیخ الہند''، اشرف السوانح، اور حضرت شیخ الحدیث صاحب قدس سرہ کی '' آپ بیتی '' کا اجتماعی مطالعہ خاص طور پر مفید ہو گا۔ (۳) ہر مدرسہ کے اساتذہ اور مہتممین کے لئے کسی شیخ طریقت سے باقاعدہ اصلاح وتربیت کا تعلق قائم کرنا ضروری سمجھا جائے، اور اساتذہ کے تقرر اور ترقی وغیرہ میں اس کے اس پہلو کو بطور خاص نظر میں رکھا جائے۔

(۴) جس مدرسے سے قریب کوئی صاحب ارشاد بزرگ موجود ہوں، وہاں کے اساتذہ اور طلبہ ان کی صحبت وخدمت کو غنیمت کبریٰ سمجھ کر اختیار کریں، اور کبھی کبھی مدرسے میں ان کے اجتماعی وعظ ونصیحت کا اہتمام کیا جائے۔

امید ہے کہ انشاء اللہ اس قسم کے اقدامات سے مدارس کی فضا بہتر ہوگی، اور ہم اپنے جس مرکز سے رفتہ رفتہ ہٹتے جا رہے ہیں، اس کی طرف لوٹنے میں مدد ملے گی۔

دوسرا مسئلہ نصاب تعلیم کا ہے۔ دینی مدارس میں اس وقت جو نصاب رائج ہے، وہ بنیادی طور پر درس نظامی کا نصاب ہے، یہ نصاب ایک عالم دین کی جملہ ضروریات کو مدنظر رکھ کر ترتیب دیا گیا تھا، اور اس میں ہر علم وفن کے اندر ایسی کتابیں تجویز کی گئی تھیں جو سطحی اور سرسری معلومات کی بجائے اس علم وفن میں مستحکم اور ٹھوس استعداد پیدا کریں، اور اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمارے نزدیک اس بنیادی ڈھانچے میں بہت زیادہ انقلابی تبدیلیوں کی اب بھی ضرورت نہیں، البتہ قویٰ کے انحطاط اور وقت کی علمی ودینی ضروریات کے پیش نظر مختلف حیثیتوں سے نظر ثانی کی ضرورت ہے، اس وقت ہمارے نظام تعلیم میں جو خلا محسوس ہوتا ہے، یا اس میں جو نقائص پیدا ہو گئے ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

دینی مدارس کو عربی زبان سے جو خصوصی تعلق ہے، وہ محتاج بیان نہیں، عربی زبان تمام دینی علوم کے لئے بنیادی زینے کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن ہمارے مدارس میں عربیت کا ذوق، اور عربی تحریر و تقریر کا ملکہ افسوسناک حد تک نایاب ہے، اچھی استعداد رکھنے والے طلبہ زیادہ سے زیادہ عربی کتابیں سمجھنے کی صلاحیت تو پیدا کر لیتے ہیں، لیکن عربی تحریر وتقریر کی مشق سے ـــــ الا ماشاء اللہ ـــــ بالکل عاری

ہوتے ہیں۔ اکثر متوسط درجے کے طلباء کی بھی عبارت خوانی تک درست نہیں ہوتی، اور عربی میں مضمون نگاری، تصنیف و تالیف یا تقریر و خطابت تو اچھے اچھے صاحب استعداد طلبہ کے لئے بھی کبریت احمر کا درجہ رکھتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دینی مدارس مین عربی پڑھانے کا اصل مقصد کتاب و سنت اور ان کے علوم کے اصل ماخذ تک رسائی ہے، جس کیلئے تحریر و تقریر کا ملکہ ناگزیر نہیں، لیکن اول تو اب مشاہدہ یہ ہے کہ تحریر و تقریر کی مشق کے فقدان کا اثر عبارت خوانی اور عبارت فہمی پر بھی پڑ رہا ہے، دوسرے عربی تحریر و تقریر کی مشق اگر مقصود نہ ہو تو کم از کم اس کے محمود میں تو کوئی شبہ نہیں، اور صرف و نحو، اور بلاغت و ادب کی اعلیٰ کتابوں کے پڑھنے کے بعد بھی اگر یہ وصف محمود حاصل نہ ہو تو یہ کوتاہی کچھ کم نہیں ہے۔ تیسرے عالم اسلام کے باہم مربوط ہونے کے ساتھ ساتھ اب اس بات کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ہمارے مدارس سے عربی تحریر و تقریر کی اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے افراد پیدا ہوں، جو عالم عرب سے روابط رکھ سکیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندوستان، پاکستان کے علماء نے جو عظیم الشان علمی اور دینی ذخیرہ اردو یا فارسی زبان میں چھوڑا ہے، اس سے عالم عرب کو روشناس کرا سکیں۔ اور یہ مقصد عربی تحریر و تقریر کے اعلیٰ ملکے کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

اس وقت ہمارے نظام تعلیم میں عربی صرف و نحو، ادب اور بلاغت کی تدریس پر ایک معتد بہ وقت صرف ہوتا ہے، لیکن یہ سارے علوم خالص نظریاتی انداز سے پڑھائے جاتے ہیں، اور ان کی اعلیٰ تربیت اور مشق کا کوئی اہتمام باقی نہیں رہا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض اوقات ایک طالب علم نحو و صرف کے قواعد، ان کے خود ساختہ فلسفے اور اس پر وارد ہونیوالے اعتراضات و جوابات کی بحثیں تو شرح جامی، عبد الغفور اور عصام وغیرہ کی مدد سے یاد کر لیتا ہے، لیکن اگر اس سے کہا جائے کہ وہ چند سطریں عربی زبان میں لکھ دے تو یہ بات نہ صرف یہ کہ اس کیلئے سخت دشوار ہوتی ہے، بلکہ بسا اوقات انہی قواعد کے اطلاق میں غلطیاں کرتا ہے جن کا پورا فلسفہ اسے ازبر ہے، اور اگر کوئی شخص نحو صرف کی غلطیوں سے محفوظ رہ جائے تو اسلوب اور انشاء کی غلطیاں تو لازماً ہوتی ہی ہیں۔

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ مدارس عربیت کی تصحیح و تحسین کی طرف پوری توجہ دی جائے اور مدرسے کی پوری فضا ایسی بنائی جائے جس میں عربیت رچی بسی ہوئی ہو۔ اس کے لئے مندرجہ ذیل تجاویز بطور خاص قابل ذکر ہیں:۔

(الف) ابتدائی درجات کے نصاب میں صرف و نحو کی ایسی کتابوں کا اضافہ کیا جائے جن میں قواعد کے بیان کے ساتھ ساتھ ان کے عملی اجراء کا اہتمام ہو، ہر ہر قاعدے کے ساتھ اس کی بہت سی مثالیں دے کر قاعدے کو ذہن نشیں کرایا گیا ہو، اور پھر تمرینات کے ذریعے طلباء کو

ان قواعد پر عمل کا عادی بنانے کی کوشش کی گئی ہو. عرب ممالک میں اس غرض کے لئے بہت سی کتابیں تیار ہوئی ہیں. مثلاً نحو صرف کے ابتدائی اور متوسط درجات کے لئے "النحو الواضح" اور اعلیٰ درجات کے لئے "النحو الوافی" وغیرہ۔ ان کے کتب سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔

ب) ادب کی تعلیم میں انشاء کے لئے مستقل وقت رکھ کر اس کی باقاعدہ تربیت کی ضرورت ہے. اس غرض کے لئے بھی اس وقت بہت سی کتابیں دستیاب ہیں. مثلاً "الاسلوب الصحیح للانشاء". "معلم الانشاء" وغیرہ۔ ان سے اس سلسلے میں مدد لی جا سکتی ہے۔
اسی طرح "بلاغت" کی تعلیم کے لئے ہمارے نصاب میں مختصر المعانی بالکل ناکافی ہے. اور اس سے "بلاغت" کا اصل مقصد بالکل حاصل نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس کے بجائے یا اس کے ساتھ "دروس البلاغۃ" یا "البلاغۃ الواضحۃ" اس طرح پڑھانیکی ضرورت ہے کہ اس سے بلاغت کا اصل مقصد حاصل ہو سکے۔

(ج) لیکن عربیت کا ذوق پیدا کرنے کے لئے ان تمام چیزوں سے زیادہ اہمیت جس بات کو حاصل ہے وہ مدرسے کی مجموعی فضا میں عربیت کا چلن ہے. اس غرض کیلئے ہماری رائے میں تو درجہ رابعہ سے اوپر کے تمام اسباق عربی زبان میں ہونے چاہئیں. لیکن اگر یکایک یہ تبدیلی مشکل ہو تو کم از کم مدرسے کے تمام اعلانات. دفتری اندراجات. تمام دفتری کارروائی. امتحانات کے پرچے اور ان کے نتائج وغیرہ فوری طور پر عربی میں منتقل کرنے چاہئیں. اور رفتہ رفتہ مدارس کے ماحول کو اس سطح پر لانا چاہئے کہ ان میں ذریعہ تعلیم مکمل طور پر عربی زبان بن جائے۔

(د) اساتذہ اور منتظمین اس بات کا اہتمام کریں کہ وہ آپس میں. نیز طلباء سے صرف عربی میں گفتگو کریں گے تو بہت جلد عربیت کا ایک خوشگوار ماحول پیدا ہو سکتا ہے. عادت نہ ہونے کی بنا پر شروع میں شاید دشواری پیش آئے. لیکن اگر اس دشواری پر اہتمام کے ساتھ قابو پا لیا گیا تو انشاء اللہ نتائج حاصل ہوں گے۔

(ہ) مہینے دو مہینے میں طلباء کے ایسے اجتماعات منعقد کرنے چاہئیں جن میں طلبہ عربی میں تقریر کریں اور مقالے پڑھیں۔

(۲)

دار العلوم دیوبند میں طریق کار شروع سے یہ تھا کہ قرآن کریم ختم کرنے کے بعد اور عربی کی تعلیم شروع کرنے سے پہلے طالب علم کو ایک پانچ سالہ نصاب سے گزارا جاتا تھا جو "درجہ فارسی وریاضی" کے نام سے موسوم تھا۔ اس درجے میں اردو، فارسی، دینیات، تجوید، حساب ریاضی اور جغرافیہ وغیرہ کی اس قدر معیاری تعلیم دی جاتی تھی کہ ان مضامین میں ایک عالم دین کو جتنی واقفیت ضروری ہے، ایک طرف وہ تمامتر حاصل ہو جاتی تھی، اور دوسری طرف اگر کوئی شخص کسی وجہ سے اس درجے پر اپنی تعلیم ختم کرنے پر مجبور ہو جائے تو وہ دین ودنیا کی اتنی بنیادی معلومات حاصل کر چکا ہوتا تھا کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے اچھی زندگی گذار سکے۔

یہ درجہ عربی اور اسلامی علوم کے لئے ایک بہترین بنیاد کا کام دیتا تھا، اور جب طالبعلم اس درجے سے فارغ ہو کر عربی اور اسلامی علوم کی طرف متوجہ ہوتا تو وہ اردو اور فارسی میں تحریر وانشاء کی اچھی صلاحیت کا حامل ہوتا تھا جو اس کو عربی اور اسلامی علوم کی تحصیل میں بہت مدد فراہم کرتی تھی۔

یہ درجہ موجودہ دینی مدارس میں عرصے سے یا تو ختم ہو چکا ہے، یا اس نے گھٹتے گھٹتے ایک سال کے درجہ اعدادیہ کی صورت اختیار کر لی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے، کہ طالب علم جب عربی اور اسلامی علوم کی تحصیل شروع کرتا ہے تو عام طور سے اس کی تحریر خراب، املاء اور انشاء ناقص، اور بنیادی معلومات کمزور ہوتی ہیں، اس میں عربی صرف ونحو، ادب اور فقہ وغیرہ کے اہم مضامین کو کماحقہ سمجھنے اور انھیں اچھی طرح ہضم کرنے کی پوری صلاحیت نہیں ہوتی، اور یہ مضامین اسے دشوار معلوم ہوتے ہیں، اور جب بنیاد کمزور ہو جائے تو اس کمزوری کا اثر اگلے درجات تک پڑتا ہے۔

لہٰذا یہ بات ہماری نظر میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے کہ دار العلوم دیوبند کے مذکورہ بالا طریق کار کے مطابق درجہ اعدادیہ کی مدت بڑھائی جائے اور اس میں اردو، فارسی دینیات، سیرت، تجوید حساب، ریاضی، اور جغرافیہ وغیرہ کی اتنی معیاری تعلیم دیدی جائے جو اگلے مضامین کے لئے مناسب بنیاد فراہم کر سکے۔

(۳)

درس نظامی میں تاریخ کو بطور مضمون اس لئے باقاعدہ شامل نہیں کیا گیا تھا کہ قوت مطالعہ پیدا ہونے کے بعد یہ مضمون ذاتی مطالعے سے بھی بخوبی حاصل کیا جا سکتا ہے، لیکن اب

تجربہ یہ ہو رہا ہے کہ ذاتی مطالعے کا ذوق کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عربی درجات کے نصاب میں تاریخ اور سیرت کو باقاعدہ مضمون کی حیثیت سے داخل نصاب کیا جائے۔

(۴) یہی حال تصوف اور اخلاق کا ہے کہ اس کو باقاعدہ درس میں اس لئے شامل نہیں کیا گیا تھا کہ مدارس کا پورا ماحول بذات خود اخلاق و طریقت کی عملی تربیت کرتا تھا۔ اور باقی ماندہ کسر ذاتی مطالعے اور کسی مرشد کے تعلق سے پوری ہو جاتی تھی۔ لیکن اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تصوف اور اخلاق کی کتب باقاعدہ داخل درس ہوں۔ اس مقصد کے لئے حضرت امام غزالی کی "ہدایہ الہدایہ" اور "اربعین" "احیاء العلوم" کے منتخب حصے۔ حضرت امام سہروردی کی "عوارف المعارف"۔ حکیم الامت حضرت تھانوی کی "التکشف"۔ اور "التشرف" وغیرہ مختلف درجات میں رکھی جا سکتی ہیں۔

(۵) ایک عالم دین کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جن دوسرے مذاہب و ادیان کا براہ راست اسلام سے تصادم رہا ہے۔ اور جن کے تبلیغی مشن اب بھی سرگرمی کے ساتھ مصروف عمل ہیں۔ نیز خود مسلمانوں کے وہ فرقے اور گروہ جنہوں نے اپنے کچھ مخصوص نظریات کی بنا پر اپنا مستقل وجود قائم کیا ہوا ہے۔ ان سب کے بنیادی عقائد و افکار سے وہ فی الجملہ واقفیت رکھتا ہو۔ تاکہ بوقت ضرورت ان کی جواب دہی کر سکے لہٰذا درس میں "الملل والنحل" یا "الادیان والفرق" کے نام سے ایک مستقل موضوع کا اضافہ ہونا چاہیے جس میں ان ادیان و فرق کا مختصر تعارف۔ ان کے بنیادی عقائد و افکار اور انکی تردید کے بنیادی دلائل بیان کر دیے جائیں جن کے ساتھ برصغیر کے مسلمانوں کو زیادہ واسطہ پیش آتا ہے۔ تاکہ ان سے متعلق ضروری اجمالی معلومات ہر طالب علم کو حاصل ہو جائیں اور جن لوگوں کو بعد میں ان میں سے کسی مذہب یا فرقے پر خصوصی کام کا موقع ملے۔ اس کے لئے۔ یہ تعارف ایک بنیاد کا کام دے سکے۔

(۶) علوم عصریہ کو ذریعہ معاش بنانے کے لئے مدارس کے نصاب میں ان کے اضافے کا جو تصور ہے اس کے بارے میں پیچھے ہم اپنی رائے تفصیل کے ساتھ عرض کر چکے ہیں لیکن بعض عصری علوم ایسے ہیں کہ موجودہ دور میں دین کی موثر تبلیغ اس کے کماحقہ دفاع اور اس کی صحیح خدمت کے نقطہ نظر سے ایک عالم کیلئے بحیثیت عالم ان کی فی الجملہ واقفیت ضروری یا مفید ہو گئی ہے۔ مثلاً انگریزی زبان۔ جدید مغربی فلسفہ۔ معاشیات سیاسیات اور اصول قانون۔ اس کی وجوہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(الف) جدید مغربی تعلیم کے اثر سے دنیا میں جتنی گمراہیاں پھیلی ہیں، ان سب کے سرچشمے انگریزی زبان میں ہیں، اور جب تک ان گمراہیوں کے اصل منابع سے ماہرانہ واقفیت نہ ہو ان کی تردید اور ان پر تنقید و تبصرہ ان لوگوں کے لئے پوری طرح موثر نہیں ہوتا جو ان سے براہ راست مطالعے سے مرعوب و متاثر ہوئے ہیں۔

یہ تقریباً وہی صورت حال ہے جو عباسی خلافت کے زمانے میں یونانی فلسفہ کے رواج عام طور سے پیدا ہوئی تھی، اس وقت فکری اور عقلی گمراہیوں کا اصل سرچشمہ یونانی منطق اور فلسفہ تھا اور جن لوگوں کے ذہن اس سے مرعوب و متاثر تھے ان کے شکوک و شبہات کا موثر علاج اسی طرح ہو سکتا تھا کہ علماء اسلام اس منطق اور فلسفے کو داخل نصاب کیا، اس میں اعلیٰ درجے کی مہارت پیدا کی، اور پھر وقت کی گمراہیوں کا ایسا موثر سدباب کیا کہ وہ ایک ایک کر کے اپنی موت آپ مر گئیں۔

اس وقت دینی علوم کے نصاب میں منطق اور فلسفے کو اس لئے داخل نہیں کیا گیا تھا کہ علماء اسے ذریعہ معاش یا اپنا مستقل مشغلہ بنائیں گے، بلکہ اس کا مقصد وقت کی ایک اہم دینی ضرورت کو پورا کرنا تھا۔

بعینہ اسی طرح آج مغرب سے اٹھنے والے نظریات اور ان کی گمراہیوں نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، اور عالم اسلام کا بھی وہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ معاشرے کی ایک موثر قوت کی حیثیت رکھتا ہے، انہی نظریات سے متاثر اور بڑی حد تک ان کے رنگ میں رنگا ہوا ہے، ان نظریات کی تردید میں اب تک جو کام ہوا ہے وہ ان لوگوں کے ایمان ویقین کے تحفظ کے لئے تو کسی درجے میں کار آمد ہے جن پر دین کی گرفت پہلے ہی سے مضبوط ہے، لیکن جو لوگ ان نظریات سے ایسے متاثر ہوئے ہیں کہ ان پر دین کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے، ان کو واپس لانے کے لئے کافی نہیں، ایسے لوگوں کے لئے اسی طرز پر کام کی ضرورت ہے جس طرز پر یونانی نظریات کی یلغار کے مقابلے متکلمین اسلام نے انجام دیا تھا، یہ کام علمائے امت کے ذمے ایک قرض ہے جس کے ادائیگی میں جتنی تاخیر ہوگی، مغربی گمراہیوں کا دائرہ اتنا ہی وسیع ہوتا جائیگا۔

(ب) چونکہ ان مغربی نظریات پر موثر اور بھرپور تنقید کے لئے ان کے اصل ماخذ تک رسائی ضروری ہے، اس لئے ابتک یہ کام ان لوگوں نے انجام دیا ہے جو ان ماخذ تک رسائی تو رکھتے تھے لیکن انہوں نے دینی علوم باقاعدہ متوارث طور پر اساتذہ سے نہیں پڑھے تھے اس سے بجائے ان کی دینی معلومات متفرق مطالعے پر مبنی تھیں، جس سے نتیجہ یہ کہ

علم کا رسوخ حاصل نہیں ہوتا. اس لئے ان لوگوں نے ان مغربی نظریات کے مقابلے میں دین کی جو تشریح و تعبیر کی وہ طرح طرح کی غلط فہمیوں پر مبنی تھی. اور نئی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں جن سے خود مسلمانوں کے درمیان افتراق و انتشار کا دروازہ کھل گیا۔ ان نئی غلط فہمیوں کا موثر سدباب صرف سلبی انداز میں نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ علم دین میں رسوخ رکھنے والے علماء بذات خود ایجابی طور پر وہ کام کریں جس کی غلط انجام دہی نے ان نئی گمراہیوں اور غلط فہمیوں کو جنم دیا ہے۔

(ج) مغرب کے مستشرقین نے عربی اور اسلامی علوم پر "تحقیق" کے نام سے ایسے زہریلے لٹریچر کا ایک انبار تیار کر دیا ہے. جس کا مقصد دین کے بنیادی مسلمات کو مشکوک بنانا ہے یہ لٹریچر جدید ذہن کی نفسیات کے مطابق اور اس اسلوب میں تیار کیا گیا ہے. جو آج کے ذہن کو اپیل کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے. اور عالم اسلام کا کوئی خطہ اس کے زہریلے اثرات سے خالی نہیں۔ اس زہر کا تریاق فراہم کرنا علماء کی ذمہ داری ہے. اور اس کے لئے انگریزی زبان اور ان عصری علوم کی تحصیل لازمی ہے. جن کو اس کارروائی کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔

(د) اس وقت مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد یورپ، امریکہ، افریقہ، آسٹریلیا اور مشرق بعید کے ممالک میں آباد ہے. ان لوگوں کو، بالخصوص ان کی نئی نسلوں کو اسلام پہنچانے کا کوئی راستہ انگریزی زبان کے بغیر ممکن نہیں۔ ان خطوں کے مسلمانوں کو اب اپنی نئی نسلوں کے دین کی حفاظت کا مسئلہ درپیش ہے، اور وہ اس غرض کے لئے کافی جدوجہد کے بعد مساجد اور دینی مراکز میں ایسے علماء کی ضرورت روز افزوں ہے جو علوم دین میں مہارت کے ساتھ ساتھ انگریزی بھی جانتے ہوں، تاکہ وہ وہاں کے مسلمانوں کی دینی ضروریات پوری کر سکیں۔ راقم الحروف کو ایسے متعدد ممالک میں جانے کا بھی اتفاق ہوا ہے. اور یہاں رہتے ہوئے بھی شاید ہی کوئی مہینہ خالی گزرتا ہو جس میں وہاں سے انگریزی جاننے والے علماء کی طلب نہ آتی ہو۔

چونکہ ایسے صحیح الفکر اور راسخ علماء کی تعداد ہمارے درمیان آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے، جو انگریزی جانتے ہوں، اس لئے ان تمام مقامات پر وہ لوگ پہنچ رہے ہیں جو انگریزی تو بیشک جانتے ہیں، لیکن یا تو ان کی دینی معلومات سطحی اور سرسری نوعیت کی ہیں، یا ان کے نظریات طرح طرح کی غلط فہمیوں پر مبنی ہیں۔

(ہ) مذکورہ ممالک کے مسلمانوں کو اپنے دین کے تحفظ کے لئے انگریزی زبان میں بڑے وسیع

دینی لٹریچر کی ضرورت ہے. لیکن حال یہ ہے کہ انگریزی میں قرآن کریم کی کوئی ایک تفسیر بھی ایسی موجود نہیں ہے جسکے بارے میں آنکھ بند کر کے لوگوں کو اس کے مطالعے کا مشورہ دیا جاسکے. اسی طرح روزمرہ کے دینی اور فقہی مسائل پر مشتمل کوئی ایسی مستند کتاب اب تک تالیف نہیں ہوئی جو ان لوگوں کو دین کی تعلیمات سے ٹھیک ٹھیک روشناس کراسکے اس وقت یا تو چند گنی چنی اردو کتابوں کے تراجم ہیں جن کی صحت کی بھی کوئی ضمانت نہیں، یا پھر اہل باطل کا فراہم کیا ہوا لٹریچر ہے جسے لوگ چار و ناچار پڑھنے پر مجبور ہیں. ان مسلمانوں کو دین کی تعلیمات سے روشناس کرانا اور ان کے دین و ایمان کی حفاظت علماء ہی کے فرائض میں داخل ہے، جو انگریزی زبان کے بغیر ممکن نہیں۔

(و) موجودہ صنعتی دور نے تجارت و معیشت کے شعبے میں ایسے پیچیدہ معاملات کو رواج دیا ہے کہ اب ایک مسلمان تاجر کو قدم قدم پر معاملات کی نئی نئی صورتیں پیش آتی ہیں ان صورتوں کا صریح شرعی حکم فقہ کی مروجہ کتب میں اس لئے نہیں مل سکتا کہ یہ صورتیں عصر جدید ہی کی پیداوار ہیں۔ اور ان کا تصور پہلے نہیں ہو سکتا تھا۔ ان صورتوں کو سمجھ کر ان کا صحیح فقہی حکم بتانا علماء ہی کا کام ہے. اور یہ کام اسی وقت ٹھیک ٹھیک انجام پا سکتا ہے جب علماء ان صورتوں کو ان کی تمام تفصیلات اور پس منظر کے ساتھ سمجھیں. اور اس کے بعد فقہی اصولوں کے مطابق ان کا حکم بتائیں۔ ابتک ہوتا یہ ہے کہ صورت مسئلہ بیان کرنے کی ذمہ داری مستفتی پر ہوتی ہے. اس لئے وہ جیسا سوال لکھ لاتا ہے. اسی کے مطابق جواب چلا جاتا ہے. لیکن مستفتی چونکہ عالم نہیں ہوتا اس لئے وہ بسا اوقات اپنی لاعلمی کی بنا پر صورت مسئولہ کے وہ اہم اجزاء جن پر جواب کا دارومدار ہوتا ہے. بیان نہیں کر پاتا. اس لئے جواب مختلف ہو جاتا ہے ـــــــ اور یہ بھی صرف ان معاملات میں ہوتا ہے. جن کے بارے میں تاجر کے دل میں کوئی شبہ اور اس کی بنیاد پر استفتاء کا قوی داعیہ پیدا ہو جائے، ورنہ اب اکثریت ان افراد کی ہے. جن کو کوئی شبہ پیدا نہیں ہوتا، یا استفتاء کا تقاضا پیش نہیں آتا۔

لہٰذا جس طرح حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ بازاروں میں گھوم گھوم کر تاجروں کے معاملات کو پہلے سے از خود سمجھنے کا اہتمام فرماتے تھے، تاکہ ان تمام معاملات کا شرعی حکم مدون کر جائیں. اور استفتاء کے موقع پر مستفتی کی تشریح کے محتاج نہ ہوں. موجودہ دور کے اہل علم کا بھی یہ فریضہ ہے کہ وہ اہل عصر کے معاملات کو اچھی طرح سمجھیں. اور اس کے بعد حسب ضرورت تصنیف و تالیف اور فتوی کے ذریعے ان معاملات کا شرعی حکم امت پر

واضح کریں۔ اس غرض کے لئے معاشیات کا اتنا علم جس سے اہل عصر کے معاملات اور ان کے تجارتی مسائل کا علیٰ وجہ البصیرۃ علم ہو سکے، ایک عالم دین کیلئے ضروری ہو گیا ہے۔

(ز) اس وقت جدید معاشی اور سیاسی نظریات نے پوری دنیا کو متحارب کیمپوں میں بانٹ دیا ہے، اسلامی ممالک بھی عملاً انہی میں سے کسی نہ کسی کیمپ کے ساتھ وابستہ، اور ہر پسماندہ یا ترقی پذیر ملک ان دونوں کی آویزش کا اکھاڑہ بنا ہوا ہے۔ سرمایہ داری، اشتراکیت اور سیکولر سیاسی نظریات مسلمانوں کے درمیان اپنے افکار کے پرچار اور مسلمانوں کو اپنے رنگ میں رنگنے کی پوری پوری کوشش کر رہے ہیں، اس صورت حال کا مقابلہ علماء ہی کے فرائض میں داخل ہے، کیونکہ وہی دین کا پورا تحفظ کرتے ہوئے مسلمانوں کو صحیح راہ عمل بتا سکتے ہیں۔ لیکن اس غرض کے لئے ان تمام نظریات سے واقفیت ضروری ہے۔

(ح) اس وقت عالم اسلام میں رفتہ رفتہ یہ شعور جڑ پکڑ رہا ہے کہ ہم نے جدید عصری علوم کو مغربی قالب کے ساتھ جوں کا توں اپنا کر کس قدر سنگین اجتماعی غلطی کی ہے، چنانچہ اب یہ آوازیں تقریباً ہر اسلامی ملک میں اٹھ رہی ہیں کہ ان علوم کو اسلامی رنگ میں رنگ کر اپنے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھانا چاہئے، اور ان علوم کی نصابی اور تحقیقی کتابوں میں اسلامی تعلیمات، علماء اسلام کے افکار اور ان کی خدمت کو اس طرح سمونا چاہئے کہ اس مغربی افکار کی بالادستی ختم ہو جائے۔ اس غرض کے لئے اب عالم اسلام میں جگہ جگہ مختلف علوم کے تحقیقی مراکز قائم ہو رہے ہیں، ان مراکز میں ایسے رجال کار کی ضرورت ہے، جو دین کا وسیع عمیق علم رکھنے کے ساتھ ساتھ متعلقہ موضوع سے بھی کماحقہ واقف ہوں، اور چونکہ راسخ الفکر علماء میں ایسے لوگ کمیاب، بلکہ نایاب ہیں، اس لئے ان مراکز میں وہ ذہن پنپ رہا ہے، جو دین کی صحیح بصیرت نہیں رکھتا۔

ان مراکز کے اثرات و نتائج جلدی تو ظاہر نہیں ہوں گے، لیکن دس بیس سال میں ان کے نتائج پوری طرح منظر عام پر آجائیں گے، اور علوم عصریہ کی تمام درسگاہوں میں انہی کی تحقیقات سکہ رائج الوقت بنیں گی۔ لہٰذا ان مراکز کی صحیح تحقیقی رہنمائی کا فریضہ بھی علماء دین پر عائد ہوتا ہے، جس کے لئے متعلقہ موضوعات کی فی الجملہ واقفیت ناگزیر ہے۔

یہ تمام کام، جن کی ضرورت واہمیت سے شاید ہی کوئی دردمند اور سلیم الفکر مسلمان انکار کر سکے، ایک دو یا چند افراد کے بس کے نہیں ہیں، اور نہ یہ ساری ضروریات کسی مختصر مدت میں پوری ہو سکتی ہیں اس کے لئے ایسے پختہ کار راسخ الفکر اور ذی استعداد علماء کی پوری کھیپ درکار ہے، جو اپنی اپنی

طبعی مناسبت کے لحاظ سے اپنے لئے کام کے مختلف دائرے تجویز کرے۔ اور ان دائروں میں شب و روز محنت کر کے یہ قرضہ چکائے۔ مگر اس سارے کام کی بنیاد دینی مدارس ہی میں فراہم کرنی ہوگی۔

یہاں یہ وضاحت بھی مناسب ہے کہ دینی مدارس میں ان مضامین کی تدریس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان تمام مضامین کے متخصصین پیدا کرنے مقصود ہیں۔ اور نہ یہ تاثر درست ہے کہ ان مضامین کی تدریس کے لئے کوئی بہت زیادہ وقت صرف کرنا ضروری ہوگا۔ اس لئے کہ بفضلہٖ تعالیٰ درس نظامی کی یہ خاصیت ہے کہ جو شخص اس نصاب کو قرار واقعی طور پر پڑھ لے اس کا ذہن منضبط اور علمی و فکری باتوں کے لئے پوری طرح تیار ہو جاتا ہے۔ اور وہ ایسی باتوں کا ادراک بہت جلد کر لیتا ہے جسے سمجھنے میں دوسرے لوگوں کو کافی دیر لگتی ہے۔ اس لئے اگر دینی مدارس کے طالب علم کو انگریزی زبان کے ساتھ مذکورہ بالا چند مضامین کی بنیادی واقفیت حاصل ہو جائے تو وہ ضرورت کے وقت انشاء اللہ اس بنیاد پر عمارت خود کھڑی کر سکے گا۔

ہمارے نزدیک موجودہ دور میں علماء کی خدمات اور ان کی کوششوں کو موثر بنانے اور ان کا دائرۂ اثر بڑھانے کیلئے مذکورہ بالا اقدامات نہایت ضروری ہیں، لیکن ——— (اور یہ "لیکن" بھی ہمارے نزدیک بے حد اہمیت رکھتا ہے) ——— ان اقدامات سے پہلے یا ان کے ساتھ ساتھ اسبات کا پورا اطمینان ضروری ہے کہ دینی مدارس میں اتباع سنت کا وہ مزاج و مذاق جو ان مدارس کی اصل روح اور انکی سب سے قیمتی متاع ہے۔ اسے کسی بھی مرحلے پر ادنی ٹھیس نہ لگے۔ اس مزاج و مذاق کے بارے میں ہم اپنی گزارشات اسی مضمون کے ابتدائی حصے میں پیش کر چکے ہیں۔ اور اس کا تحفظ ہر قیمت پر ضروری ہے۔ کیونکہ اس کو مجروح کر کے جو کام بھی کیا جائے گا۔ وہ ان مدارس کو تباہی کی طرف لے جائے گا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ جن مضامین کے اضافے کی تجویز سابقہ صفحات میں پیش کی گئی ہے وہ اس وقت مفید ہو سکتی ہے جب ان مدارس کے اصل علوم عالیہ تفسیر، حدیث، فقہ اصول فقہ وغیرہ کے معیار تعلیم میں نہ صرف یہ کہ کوئی ادنی خلل یا نقص واقع نہ ہو۔ بلکہ ان کے معیار تعلیم کو مزید مضبوط اور مستحکم بنایا جائے۔

ان دونوں ناگزیر شرطوں کے پیش نظر ہمارے نزدیک یہ ضروری ہے کہ جن عصری مضامین کو داخل نصاب کیا جائے۔ ان کے لئے ایسے پڑھانے والے تلاش کئے جائیں جو اپنے مزاج و مذاق کے اعتبار سے دینی مدارس سے فکری اور عملی طور پر پوری طرح ہم آہنگ ہوں اور اپنی تدریس کے دوران طلبہ کا ذہن ان مضامین کے مقصد تدریس کیلئے تیار کرتے رہیں۔ اس غرض کے لئے اگر مدارس

کو اپنے بعض اساتذہ کو رخصت دے کر تیار کرنا پڑے تو اس میں بھی چنداں حرج نہیں ہوگا اور ظاہر ہے کہ مضامین کا یہ اضافہ بتدریج ہی مناسب ہوگا۔ اس لئے اگر ایک مرتبہ اصولی طور پر مذکورہ بالا مقاصد کی تحصیل کی طرف توجہ ہو جائے تو رفتہ رفتہ اس کے مناسب وسائل انشاء اللہ فراہم ہوتے جائیں گے۔

(۷) نصاب سے متعلق ساتویں بات منطق اور فلسفے کی تعلیم سے متعلق ہے۔ بعض حضرات یہ رائے پیش کرتے ہیں کہ یونانی فلسفے کے زوال کے بعد ان مضامین کو پڑھانے کی چنداں حاجت باقی نہیں رہی۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ بات بوجوہ درست نہیں۔ ان مضامین کی اہمیت کیلئے تنہا یہ بات بھی کافی ہے کہ ہمارے اسلاف کی کتابوں کا عظیم الشان ذخیرہ، بالخصوص اصول فقہ، انہی علوم کی اصطلاحات اور منطقی انداز و اسلوب پر مشتمل ہے۔ اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے اور اس سے استفادہ کیلئے منطق اور فلسفے کی واقفیت ضروری ہے۔ آج "تفسیر کبیر" جیسے دریائے علم سے استفادہ اس کے بغیر ممکن ہی نہیں کہ انسان منطق اور فلسفے کا علم رکھتا ہو لہٰذا ان مضامین کو یکسر ختم کر دینا ہمارے نزدیک سخت نقصان دہ ہوگا۔ لیکن ان مضامین کو اسی حد تک پڑھانا چاہئے جس حد تک وہ اسلامی علوم کیلئے زینے کا کام دیں۔ ان کو ایک مستقل علم مقصود کے طور پر پڑھنے پڑھانے کا واقعی اب کوئی جواز نہیں۔ لہٰذا جہاں ان مضامین کی تعلیم مذکورہ ضرورت سے زائد ہو رہی ہو، وہاں اس کو ضرورت کی حد تک محدود کر کے دوسرے مضامین کیلئے گنجائش پیدا کی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ فلسفہ میں عنصریات اور فلکیات کے جو حصے اب تحقیق اور مشاہدے سے غلط ثابت ہو چکے ہیں، ان کی غلطی پر تنبیہ کے ساتھ جدید تحقیقات پڑھانا ضروری ہے۔ جس کے لئے علامہ نجیبؒ کی "توفیق الرحمٰن"، علامہ آلوسیؒ کی "ما دل علیہ القرآن" اور مولانا محمد موسیٰ صاحب کی "جدید فلکیات" سے مدد لی جاسکتی ہے۔

(۸) نصاب کے سلسلے میں آخری گزارش یہ ہے کہ قویٰ کے مسلسل انحطاط اور مسائل کی پیچیدگیوں کی بنا پر عرصے سے یہ بات محسوس ہو رہی ہے کہ دورۂ حدیث کیلئے ایک سال کی مدت ناکافی ہے۔ اس مختصر وقت میں حدیث پاک پڑھنے پڑھانے کا حق ادا نہیں ہو پاتا اور عموماً ہوتا ہے کہ حدیث کے صرف معدودے چند ابواب تحقیق و تفصیل کے ساتھ ہو پاتے ہیں کہ سال ختم ہونے لگتا ہے۔ اور اس کے بعد کے حصے تکمیل نصاب کی بھاگ دوڑ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ ایک صحیح البخاریؒ کو لے لیجئے۔ استاذ اور شاگرد شب و روز محنت کرنے کے باوجود آخر سال میں انتہائی بھاگ دوڑ پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ صحیح بخاریؒ کا کوئی بھی حصہ ایسا نہیں جسے رواداری میں گزار دیا جائے۔

اسی طرح دورہ حدیث کی بعض انتہائی اہم کتب مثلاً طحاوی شریف اور موطائین اسی وقت کی قلت کی بنا پر اکثر برائے نام ہوتی ہیں۔ حالانکہ ان کو اہتمام کے ساتھ پڑھنے کی ضرورت ہے۔ اگر دورہ حدیث کو دو سالوں پر منقسم کر دیا جائے تو امید ہے کہ انشاء اللہ علم حدیث کے ساتھ مطلوب مناسبت پیدا

ہو سکے گی اور طالب علم حدیث کے تمام ابواب علی وجہ البصیرۃ پڑھ سکے گا، اور اس کے ساتھ اصول حدیث کی کوئی معیاری کتاب مثلاً "تدریب الراوی" یا "فتح المغیث" وغیرہ بھی اہتمام کے ساتھ ہو سکے گی جو ایک حدیث کے طالب علم کے لئے ازبس ضروری ہے۔

یہ چند تجاویز ہیں جو اہل علم کی خدمت میں طالب علمانہ طور پر برائے غور پیش خدمت ہیں، وفاق کی سابقہ نصاب کمیٹی جس نے سال گزشتہ نصاب میں کچھ ترمیمات یا اضافے کئے تھے، اس نے انہی خطوط پر سوچنا شروع کیا تھا، لیکن چونکہ اس کے ساتھ ہی معادلہ کا مسئلہ بھی اٹھ کھڑا ہوا، اس لئے بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ اس تمام کارروائی کا مقصد معادلہ ہے، ہم شروع میں عرض کر چکے ہیں کہ صرف معادلہ کے نقطہ نظر سے مدارس کے نصاب ونظام میں ترمیم ہماری رائے میں کسی طرح درست نہیں، البتہ ایک عالم کی حقیقی ضروریات اور اس کی خدمات کو زیادہ موثر بنانے کیلئے مندرجہ بالا تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ نصاب کے بعد کچھ باتیں انداز تدریس وغیرہ سے متعلق بھی عرض کرنے کا خیال تھا، لیکن یہ گزارشات بھی اختصار کی انتہائی کوشش کے باوجود اندازے سے کہیں طویل ہو گئیں، اس لئے ان کو کسی اور صحبت کیلئے ملتوی رکھتے ہوئے فی الحال اتنے ہی پر اکتفا کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جو کچھ تجاویز اوپر عرض کی گئی ہیں، اس میں دردمندی اور اخلاص کے ساتھ اپنے دل کی بات واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ضروری نہیں کہ ان میں سے ہر بات درست ہو، لیکن اہل علم کی خدمت میں پیش کرنے کا منشاء ہی یہ ہے کہ ان میں سے جو بات دلائل کی رو سے درست ہو، اس پر کوئی عملی قدم اٹھایا جائے، اور اگر دلائل سے کسی بات کی غلطی واضح ہو جائے تو اسے رد کر دیا جائے۔ لیکن اس موقع پر جبکہ "وفاق المدارس" نصاب کے مسئلے پر غور کر رہا ہے، اور یہ غور بار بار نہیں ہوتا، اتنی امید ضرور ہے کہ مذکورہ بالا نکات میں نئے ہر نکتے پر اطمینان اور ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے گا، ان ارید الا الاصلاح ما اسطعت وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔ واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

(ماہنامہ "البلاغ" جمادی الاخری ۴۰۴ھ ج ۱۸ ص ۳۲۳)

علماء کے لئے لمحہ فکریہ!

دارو کوئی سوچ اپنی پریشاں نظری کا!

□□□□□□□□□□□
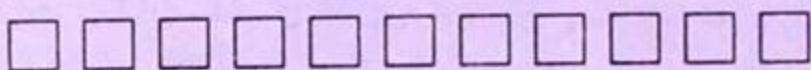
یوں تو ہر زمانے کے لوگ ہمیشہ اپنے حال کو ماضی سے بدتر قرار دیتے آئے ہیں، اور ایسا بہت کم ہوا ہے کہ لوگوں نے اپنے زمانے کو دینی اور اخلاقی معیار کے لحاظ سے ماضی سے بہتر قرار دیا ہو۔ بحیثیت مجموعی یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ عہد رسالتؐ اور عہد صحابہؓ کے بعد ہر آنیوالا دور پہلے کے مقابلے میں کچھ پستیاں ہی لے کر آیا ہے۔ لیکن جس دور سے ہم گذرے ہیں اس میں دینی اور اخلاقی زوال کی رفتار اتنی تیز اور ماضی سے اس کے فاصلے اتنے زیادہ ہیں کہ شاید تاریخ میں پہلے کبھی ایسا نہ ہوا ہو۔

حدیث میں ہے کہ قیامت سے پہلے ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اس میں مہینوں اور مہینے، ہفتوں کی رفتار سے گذریں گے۔ آج ہماری نگاہیں اس نبویؐ پیشینگوئی کو حرف بحرف پورا ہوتے دیکھ رہی ہیں؛ اب معاشرہ زوال کی طرف اس تیزی سے جا رہا ہے کہ سالوں کی مسافت مہینوں اور ہفتوں میں طے ہو جاتی ہے۔ جس انقلاب کے لئے پہلے صدیاں درکار تھیں، اب وہ دیکھتے ہی دیکھتے رونما ہو جاتا ہے۔ اور آج کے ماحول کا صرف دس پندرہ سال پہلے کے حالات کا موازنہ کیجئے تو زندگی کے ہر شعبے میں کایا ہی پلٹی نظر آتی ہے۔

یہ تیز رفتار دینی و اخلاقی زوال سالہا سال سے ہمارے مقالوں، تقریروں مذاکروں اور نشستوں کا موضوع بنا ہوا ہے۔ بے شمار جماعتیں، انجمنیں اور تنظیمیں اس پر بند باندھنے کا مقصد لے کر اٹھ رہی ہیں۔ لیکن ان ساری کاوشوں کے باوجود نہ صرف یہ کہ زوال میں کمی نہیں آتی بلکہ اس کی رفتار ہر لحظہ بڑھ رہی ہے۔ کسی بھی دیندار گھرانے کے باپ اور بیٹوں کے حالات کا موازنہ کر کے دیکھئے، اندازہ ہو جائے گا کہ صرف ایک نسل کے فرق سے زندگی کی قدروں میں کتنا عظیم انقلاب پیدا ہو چکا ہے؟

کرنے کو اس صورت حال کے بہت سے اسباب بیان کئے جا سکتے ہیں، اور کئے جاتے رہے ہیں لیکن، ہماری نظر میں اس کا سیدھا سادھا سبب یہ ہے کہ دین کی دعوت یا مفقود ہو چکی ہے یا غلط طریق کار کی وجہ سے بے اثر ہے۔ پچھلے تیس سال میں اپنے نظام تعلیم کو اسلامی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوئی نتیجہ خیز کوشش ہمارے یہاں نہیں ہوئی جو نئی نسل کو اسلام سے نظری اور عملی طور پر قریب

کر سکتی. اس لئے اس نسل کو اسلام سے روشناس کرانے کا مقصد صرف ایک دعوت و تبلیغ کے موثر نظام ہی کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا تھا لیکن افسوس ہے کہ ہم نے اس اہم فریضے کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں دی. اور اس سمت میں جو تھوڑا بہت کام ہوا وہ محدود. مختصر اور ناکافی تھا. دعوت حق کے اس زبر دست خلا نے باطل کے محرکات کے لئے راستہ پوری طرح ہموار کر دیا اور نئی نسل اسلام سے بالکلیہ بے بہرہ ہو کر رہ گئی۔

اس دوران کئی ادارے اور کئی جماعتیں دعوت و تبلیغ ہی کے مقصد سے سرگرم عمل ہوئیں. اور ان میں سے بعض نے بلاشبہ اپنے اپنے حلقوں میں گرانقدر خدمات انجام دیں لیکن اب وہ بھی روبہ زوال معلوم ہوتی ہیں. اور ان کا حلقہ اثر روز بروز سکڑتا دکھائی دیتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عام قومی زوال کا اثر خود ہمارے علماء دینی درس گاہوں. تبلیغی جماعتوں اور علمی اداروں تک جا پہنچا ہے. اب تک دعوت و تبلیغ کا جتنا کام ہوا وہ کچھ ایسی دلکش شخصیتوں کی وجہ سے ہوا جو علم و عمل کے اعتبار سے ہمارا بہترین سرمایہ تھیں. لیکن اب یہ شخصیتیں اٹھتی جا رہی ہیں. اس قرن کے جو لوگ باقی ہیں وہ چراغ سحر ہیں. اور ہر اٹھنے والا اپنے پیچھے اتنا زبر دست خلاء چھوڑ جاتا ہے کہ اس کے پر ہونے کا دور دور امکان نظر نہیں آتا. افراد کی تیاری بند ہو چکی ہے. درس گاہیں بانجھ ہوتی جا رہی ہیں. اور دعوت دین کا صحیح جذبہ اور سلیقہ رکھنے والے مفقود ہو رہے ہیں۔

ان حالات میں نئی تبلیغی جماعتیں بنانے سے زیادہ ہماری اصل ضرورت یہ ہے کہ دعوت دین کے موجودہ مراکز اپنے اپنے حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لے کر ان اسباب کا کھوج لگائیں جن کی وجہ سے ان کا کام محدود سے محدود ہوتا جا رہا ہے. ہماری نظر میں یہ وقت نئی جماعتیں بنانے کا نہیں. اس لئے کہ بحالت موجودہ ہر نئی جماعت کا قیام افتراق کا ایک نیا دروازہ کھول دیتا ہے. اس کے بجائے اس وقت جتنے دینی مدارس. جتنی موثر شخصیتیں اور جتنی تبلیغی جماعتیں دین کی کوئی خدمت انجام دے رہی ہیں. ان میں سے ہر ایک کو یہ سوچنا چاہئے کہ اس کا کام اس ہمہ گیر زوال سے کس حد تک متاثر ہوا ہے. اور اسے کس طرح مزید موثر اور زیادہ تیز رفتار بنایا جاسکتا ہے؟

ہمارا تعلق چونکہ دینی درس گاہوں سے ہے. اس لئے ہم آج اس تغیر کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں. جو ان درس گاہوں کے نظام میں واقع ہوا ہے اور جس کی وجہ سے علم دین کے میدان میں موثر شخصیتوں کی تیاری تقریباً بند ہو گئی ہے۔

علوم دین کی تدریس درحقیقت دعوت دین کا ایک اہم شعبہ ہے اور اسی کے ذریعہ ایسی شخصیات ابھر سکتی ہیں جنھیں صحیح معنی میں دین کا داعی کہا جاسکے اسی لئے ایک مدت تک علماء کا یہ خیال رہا ہے کہ تعلیم دین پر اجرت کا لین دین جائز نہیں. لیکن جب متاخرین نے یہ دیکھا کہ دین کی تدریس و تعلیم ایسا کام ہے کہ اسے خاطر خواہ طریقے سے انجام دینے کے لئے پورا وقت وقف کرنا ضروری ہے اس لئے جب تک ایک طبقے کا معاش بھی اسی تعلیم و تدریس کے ساتھ وابستہ نہ کیا جائے گا. اسلامی علوم کی کماحقہ حفاظت ممکن نہیں تو آخر زمانے کے علماء نے یہ فتویٰ دے دیا کہ جو شخص اپنے اوقات اس کام میں صرف کرتا ہو اور اس کی وجہ سے دوسرے وسائل معاش سے استفادہ کا موقع نہ ملتا ہو وہ اپنے اوقات کا معاوضہ لے سکتا ہے۔

اس کے نتیجے میں منظم دینی درس گاہیں وجود میں آئیں. اور ملت کے ایک بڑے طبقے نے تحصیل معاش کی طرف سے بے فکر ہو کر اپنی ساری توانائیاں اس کام میں صرف کر دیں. لیکن یہ بات اس راہ کا ہر مسافر جانتا تھا کہ اس راستے میں معاش ایک ضرورت ہے. مقصد نہیں اس کا اصل مقصد دین کی خدمت. افراد کی تعلیم و تربیت اور اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت ہی تھی. فکر و عمل کی ساری توانائیاں اس کے لئے وقف تھیں. دل میں اس مقصد کی لگن او اسی کا جذبہ جاری و ساری تھا. اور دنیا کو کوئی مزید لالچ اسے اپنے اصل مقصد سے دور نہیں کر سکتی تھی۔

جن لوگوں نے اس طرح دینی مدارس قائم کئے یا ان تدریس کی خدمات .... انجام دیں ان کے نزدیک تنخواہ. معاشی ترقی اور دنیوی منافع کے مسائل بالکل ثانوی حیثیت رکھتے تھے. ان کی اصل توجہ اس طرف تھی کہ وہ سراپا تبلیغ و دعوت بنکر اپنے ہر ہر قول و فعل سے اپنے زیر تربیت افراد کو مثالی مسلمان بنائیں. انہیں علم صحیح کی دولت سے مالا مال کریں. ان کے اعمال و اخلاق سنواریں. ان میں داعی دین کی روح پھونکیں اور ان کے سینوں میں اللہ کے لئے جینے اور مرنے کا جذبہ بیتاب کوٹ کوٹ کر بھر دیں۔

یہ درس گاہیں درحقیقت صرف کتابی تعلیم گاہیں نہیں تھیں. بلکہ عملی اور اخلاقی تربیت کی خانقاہیں بھی تھیں. دارالعلوم دیوبند کو اللہ نے جو غیر معمولی امتیاز بخشا اس کی اصل وجہ یہی تھی کہ وہ ایک رسمی درس گاہ نہیں تھی. جس میں طلباء کو نرا علم پڑھایا جاتا ہو. اس کے بجائے وہ ایک ایسی تربیت گاہ تھی جس میں مسلمان داعی تیار کئے جاتے تھے. اس کے عملے کا ہر ہر فرد اسی مقصد کی لگن سے سرشار تھا. اور اسی لگن نے ایسی شخصیتیں پیدا کر دیں جنھوں نے برصغیر کی تاریخ کا رخ موڑ کر رکھدیا۔

لیکن رفتہ رفتہ ان درس گاہوں سے اصل مقصد کی لگن کم ہوتی چلی گئی. ترجیحات کی ترتیب الٹ

گئی خدمت دین کا جذبہ کمزور پڑ گیا. استاد اور شاگرد کے درمیان ایک خشک کھر درا اور رسمی تعلق باقی گیا اعمال واخلاق کی تربیت مقاصد کی فہرست سے خارج ہو گئی. یہاں تک کہ تعلیم و تعلم محض ایک رسم بن کر رہ گیا جس کے اصل مقاصد سے استاد اور شاگرد دونوں غافل ہیں۔

چند نادر مستثنیات کو چھوڑ کر. اس وقت ہماری کیفیت یہ ہے کہ دین کی تعلیم و تدریس ہمارے نزدیک دوسرے پیشوں کی طرح ایک پیشہ بن چکی ہے۔ جس کا اصل مقصد حصول معاش ہے اور ثانوی مقصد خدمت دین. استاد ایک معین وقت میں درس گاہ پہنچتا ہے اور گھنٹے بھر کی ڈیوٹی ادا کر کے چلا آتا ہے طلباء کس حال میں ہیں؟ ان کی تعلیمی قابلیت کیوں کمزور ہو رہی ہے؟ ان کے اخلاق کیوں خراب ہو رہے ہیں؟ ان کی اصلاح کی کیا صورت ہے؟ یہ سب سوالات ایسے ہیں جن پر سوچنا استاد کی فرائض سے خارج ہو چکا ہے۔

جب استاد کو طلباء کی تعلیمی استعداد ہی کی کوئی فکر نہیں ہے تو وہ ان کے اعمال واخلاق کی طرف توجہ کیا دے گا؟ رہا انہیں دعوت دین کی تربیت دینا اور ان میں دین کے لئے قربانی دینے کا جذبہ ابھارنا. سو یہ تو بہت ہی دور کی چیز ہے. اس پہلو پر تو سوچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ان حالات میں جو لوگ ہمارے ہاتھوں قوم کے رہنما بننے کے لئے تیار ہونگے. اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان میں دینی رہنمائی کی کتنی صلاحیت ہوگی؟ وہ کیسی دعوت کیسی تبلیغ کر سکیں گے؟ اور ان کی دعوت وتبلیغ کس حد تک موثر ہو سکے گی؟

اسلام کبھی رسمی جماعتوں اور انجمنوں سے نہیں پھیلا. وہ زیادہ تر افراد کے کردار و عمل سے پھیلا ہے. اگر ہمارے یہاں افراد تیار نہیں ہو رہے. اگر ہماری درس گاہیں بانجھ ہو رہی ہیں اور ان میں شخصیتوں کی تعمیر کا کام بند ہو چکا ہے تو آپ ہزار جماعتیں بنالیجئے. لاکھ کتابیں لکھ ڈالئے. آپ کی دعوت تبلیغ کبھی موثر نہیں ہو سکتی. اس لئے اس وقت کی سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے تعلیم وتربیت کے نظام پر نظر ثانی کر کے اس کے جسد مردہ میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کریں۔

آج کل دینی مدارس کے نصاب میں ترمیم کی صدائیں بار بار بلند ہوتی رہتی ہیں. اور کوئی شک نہیں کہ بحالات موجودہ یہ نصاب بھی ضروری ترمیم واضافہ کا متقاضی ہو چکا ہے لیکن ہماری نظر میں اس سے کہیں زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ دینی مدارس کے ماحول میں اس جذبے کو دوبارہ بیدار کیا جائے جس کی تحت یہ درس گاہیں قائم ہوئی تھیں اور جو اب مرور ایام سے سرد پڑ چکا ہے. بنیادی ضرورت اس کی ہے کہ ہم میں اپنے مقصد زندگی کی نہ مٹنے والی لگن پیدا ہو. ہم تعلیم و تدریس کے فرائض پیشے کے طور پر نہیں. زندگی کے عزیز ترین مشن کے طور پر انجام دیں. اور اپنے فکر و عمل کے تمام طاقتیں اس کام میں

صرف کریں کہ زیر تعلیم و تربیت افراد صحیح معنی میں مسلمان، عالم دین اور داعی و مبلغ بن سکیں۔ اگر یہ نہیں ہوتا تو بہتر سے بہتر نصاب بھی حالات میں خوشگوار تبدیلی نہیں لا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو جماعت اپنے آپ کو علم دین کے لئے وقف کرے ان کا کام صرف پڑھانا یا سمجھنا سمجھانا ہی نہیں بلکہ قرآنی ارشاد کے مطابق اس کی پوری زندگی کے صرف دو مقصد ہیں یہی ان درس گاہوں کا مکمل نصاب ہے۔ جس کو قرآن کریم نے دو لفظوں میں بیان فرمایا لیتفقہوا فی الدین ولینذروا قومھم جس کا حاصل دو چیزیں ہیں اول دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنا جس میں صرف کتابوں کا سمجھ لینا کافی نہیں، بلکہ ان کے مقتضی پر عمل اور اپنے اعمال و اخلاق میں دینی رنگ بھرنا بھی شامل ہے۔ حضرت حسن بصریؒ نے تفقہ فی الدین کی یہی تفسیر بیان فرمائی ہے دوسرے قوم کو مشفقانہ انداز یعنی دعوت و تبلیغ کے ذریعہ ان کو علم صحیح اور عمل مستقیم کی ہدایت دینا اور اس کے اعمال و اخلاق کی اصلاح کرنا مگر افسوس ہے کہ عرصہ دراز سے ہماری درس گاہیں ان قرآنی مقاصد کو بھلا بیٹھی ہیں اسی کا نتیجہ ہے، جو کچھ دیکھ رہے ہیں۔

درس گاہوں کی فضا میں یہ تجدیدی انقلاب لانے کے لئے طریق کار کیا ہو؟ ہمارا یہ منصب نہیں ہے کہ اس سلسلے میں لگی بندھی تجاویز پیش کر سکیں۔ یہ کام اکابر ملت اور ارباب فکر کا ہے، ہاں ہم ضرور سمجھتے ہیں کہ ــــــــــ اس کام کے لئے اصل چیز لگے بندھے ضابطوں سے زیادہ مدارس کے ذمہ داروں کی توجہ اور لگن ہے، اگر دینی درس گاہوں کے ارباب بست و کشاد اپنے اپنے حالات کا جائزہ لیں اور اندازہ لگائیں کہ ہم اپنے اصل مقاصد سے کتنی دور نکل آئے ہیں تو مقصد کی طرف لوٹنے کا جزبہ طریق کار خود بخود سکھا دیگا۔

ان گزارشات سے ہمارا منشاء صرف اتنا ہے کہ ہمیں بلا تاخیر اس صورتحال پر سنجیدگی کے ساتھ سوچنا چاہئے اللہ کے فضل و کرم سے ابھی تک ہم میں کچھ ایسی برگزیدہ ہستیاں، موجود ہیں، جنھوں نے دین کے لئے اخلاص و ایثار کے ماحول میں آنکھ کھولی اور جن کی پاکیزہ زندگیاں مجسم تبلیغ و دعوت ثابت ہوئیں، اور ہم سمجھتے ہیں کہ انہی کے جذب دروں نے ابھی تک بہت سے طوفان کو روک رکھا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان ہستیوں کی موجودگی میں اس موضوع پر پوری اہمیت کے ساتھ غور کیا جائے اور ان حضرات کی رہنمائی سے فائدہ اٹھا کر اپنے تعلیم و تربیت کے نظام کو از سر نو ایسے خطوط پر رواں کر دیا جائے جو آنیوالے خطرات کا سدباب کر سکیں۔

اس غرض کے لئے ہم ایک مختصر سا سوالنامہ اکابر ملت اور ارباب فکر کی خدمت میں بھیج رہے ہیں، تاکہ وہ اس معاملے میں ملت کی رہنمائی فرما سکیں۔

سوالات یہ ہیں:۔

(۱) یہ ایک عام تاثر ہے کہ ہماری موجودہ دینی درس گاہوں سے موثر علمی و دینی شخصیتوں کی تیاری تقریباً بند ہو رہی ہے۔ جناب کی نظر میں اس کے کیا اسباب ہیں؟

(۲) موجودہ دینی مدارس کو دوبارہ مردم خیز اور امت کے لئے زیادہ نفع بخش بنانے کے لئے کونسے اقدامات آپ کی نظر میں ضروری ہیں؟

(۳) محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہماری دینی درس گاہوں میں تعلیم و تعلم کا اصل مقصد نگاہوں سے اوجھل ہوتا جارہا ہے۔ براہ کرم نشاندہی فرمائیں کہ آپ کی نظر میں یہ مقصد کیا ہے؟ اور اہل مدارس میں اس کا ایسا استحضار کیوں کر پیدا کیا جاسکتا ہے جو ان کے فکر و عمل پر اثر انداز ہوسکے؟

یہ سوالنامہ اکابر ملت کی خدمت میں بھیج رہے ہیں۔ اس کے جو جوابات موصول ہونگے انشاء اللہ انھیں البلاغ میں شائع کیا جائیگا۔ اس کے علاوہ دوسرے قارئین سے بھی درخواست ہے کہ وہ ان سوالات پر غور فرمائیں گے۔ اور اگر کوئی مفید بات ذہن میں آئے تو اسے تحریر کرکے ہم تک پہنچا دیں۔ البلاغ ایسی تمام تجاویز کا خیر مقدم کرے گا۔ خدا کرے کہ اس طرح ہم کسی مفید نتیجے تک پہنچ سکیں۔

بات ہم نے شروع کردی ہے۔ اسے آگے بڑھائیے۔ اسے اپنی سوچ بچار، گفتگو اور تبادلہ خیل کا موضوع بنائیے یہاں تک کہ یہ زندگی کی اولین تڑپ کی صورت اختیار کرلے۔ وما علینا الا البلاغ۔

اصحاب مدارس کی خدمت میں

ہم نے رجب ۱۳۹۱ھ کے شمارے میں اہل مدارس علماء کی خدمت میں کچھ گزارشیں پیش کی تھیں، ان معروضات کا مقصد یہ تھا کہ ہم جس ہمہ گیر دینی واخلاقی زوال کے دور سے گذر رہے ہیں، اس کے دور دور بیٹھ کر شکوے کرنے کے بجائے اپنے اپنے گریبانوں میں منہ ڈالیں، اور یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ ہم خود اس زوال سے کس حد تک متاثر ہوئے اور کس حد تک اسکی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے یہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں کہ اس عام زوال کا اثر ہمارے دینی اداروں، دینی جماعتوں اور درس گاہوں تک پہنچا ہوا ہے، اور یہاں سے تیار ہونیوالی شخصیتیں بھی اس سے متاثر ہوئی ہیں، لہٰذا امت کی عمومی اصلاح اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ملت کا وہ طبقہ اپنی اصلاح کی فکر نہ کرے جسے عوام کی رہنمائی کا مقام حاصل ہے۔

ہم نے یہ عرض کیا تھا کہ دین کی خدمت کا جو کام جہاں ہو رہا ہے، وہاں اس کے طریق کار پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، ہم چونکہ مدارس کے حلقے سے وابستہ ہیں، اس لئے ہمیں اپنی ان غلطیوں اور کوتاہیوں کا جائزہ لینا چاہئے جو دینی مدارس کے نظام صلاح واصلاح میں رخنے ڈالتی رہی ہیں۔ اس غرض کے لئے ہم نے چند سوالات مرتب کر کے اکابر علماء کی خدمت میں بھی بھیجے تھے اور انھیں عمومی غور وفکر کے لئے البلاغ میں شائع بھی کیا تھا۔

یہ بات اطمینان بخش اور باعث مسرت ہے کہ دینی مدارس کے حلقوں سے اس تحریر کا خیر مقدم کیا اور کھلے دل کے ساتھ اپنے آپ پر تنقید کو نہ صرف سنا بلکہ اسے آگے بڑھا کر اس پر اضافے بھی کئے۔ ہم معاصر مؤقر ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک کے بھی شکر گزار ہیں کہ اس نے ہماری ان ناچیز گزارشات کو اپنے حلقے میں پھیلا کو غور وفکر کا دائرہ مزید وسیع کیا۔

اس تحریر سے ہمارا اصل مقصد محض ارباب مدارس کو اس جانب توجہ دلانا تھا اور سوالات اس غرض کے لئے قائم کئے گئے تھے کہ ہر وہ شخص جو دینی مدارس کے انتظام وتدریس سے متعلق ہے ان پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرے۔ اس کے بعد اکابر علماء کی طرف سے جو جوابات موصول ہوں، ان کی

روشنی میں اپنے طرز عمل کا جائزہ لے اور اس کی اصلاح کی کوشش میں لگ جائے۔

ہمیں ان سوالات کے متعدد جوابات موصول ہوئے ہیں، انشاء اللہ اس شمارے سے یکے بعد دیگرے ان کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو جائے گا، اور ہمیں امید ہے کہ انشاء اللہ یہ جوابات ہم سب کے لئے سرمایہ بصیرت ہوں گے اور ان کی روشنی میں کام کی ایک نئی امنگ بیدار ہو سکے گی۔

ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض جوابات کی باتیں قارئین کو پیش پا افتادہ سی معلوم ہوں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہی پیش پا افتادہ باتیں وہ ہیں جو ہمارا صرف قال بن کر رہ گئی ہیں، اور زبان و قلم سے آگے ان کا دائرہ کار ختم ہو چکا ہے، ضرورت ہے کہ یہ باتیں خواہ کتنے ہی سامنے کی ہوں، بار بار ہمارے سامنے آئیں اور ان کے تکرار در تکرار سے ان کا ہمہ وقتی استحضار پیدا ہو، عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ اسی طرح اس قال کو حال میں تبدیل فرما دے، اس لئے ہماری پر خلوص گزارش یہ ہے کہ ان جوابات کو تمام اہل مدارس اہتمام کے ساتھ پڑھیں، بار بار پڑھیں اور اس فکر کو اپنی زندگی کی لگن بنالیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اس مہینے سے ملک بھر کے تمام دینی مدارس میں نئے تعلیمی سال آغاز ہو گا۔ ہم مدارس کے اصحاب انتظام سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے مدرسہ میں تعلیم کا آغاز کرنے سے پہلے تمام اساتذہ کا ایک اجتماع منعقد کریں، اور اس میں یہ سوالات سامنے رکھ کر ان پر اجتماعی طور سے غور و فکر کیا جائے۔ ایسے اجتماعات میں جن مثبت تجاویز پر اتفاق رائے ہو انہیں مرتب کر کے اگر البلاغ میں اشاعت کے لئے بھیج دیا جائے تو انشاء اللہ اس سے مزید فائدے کی توقع ہے۔

اس موضوع پر اکابر ملت کے ارشادات تو انشاء اللہ البلاغ کے ذریعہ رفتہ رفتہ سامنے آجائیں گے، لیکن چونکہ اس ماہ سے تعلیمی سال کا آغاز ہو رہا ہے، اور یہ اپنے فکر و عمل میں خوشگوار تبدیلیاں لانے کا بہترین موقع ہے، اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اکابر کے جو ارشادات ہم تک پہنچے ہیں ان کی روشنی میں چند مثبت تجاویز ان ہی سطور میں پیش کر دیں، تاکہ ضروری باتیں زیادہ بروقت اپنے مقام تک پہنچ سکیں۔

یہاں ہم ایک بار پھر یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمارا ہرگز یہ مقام نہیں ہے کہ حضرات علماء اور ارباب مدارس کو کوئی قابل ذکر مشورہ بھی دے سکیں، اس لئے آئندہ سطور میں جو کچھ عرض کریں گے وہ ہماری اپنی بات نہیں ہے، بلکہ اکابر علماء کے ارشادات کی شرح و توضیح ہے، اور اس کا مخاطب ہم سب سے پہلے اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان پر عمل کرنیکی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ہمارے لئے سب سے زیادہ اہم اور بنیادی طور پر سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے ؟اور اپنے شب و روز کی جدوجہد میں ہم اس مقصد سے کس حد تک قریب ہو رہے ہیں ؟——اہل علم کے سامنے اس حقیقت کو بیان کرنے کیلئے تفصیل کی ضرورت نہیں کہ دینی مدارس کا اصل مقصد ایک ایسا نظام صلاح و اصلاح قائم کرنا ہے، جس میں تمام لوگ پہلے اپنی اور پھر دوسروں کی اصلاح کے طریقے سیکھیں، پھر اپنے عمل کو علم صحیح کے مطابق بنائیں اور اس طرح ایک ایسا مثالی اسلامی ماحول تیار ہو جو عام دنیا کیلئے ایک نمونہ بن سکے. اساتذہ اپنے شاگردوں کو علم کا محض ایک ظاہری خول نہ دیں بلکہ ان میں ذوق عمل پیدا کرنے کی کوشش کر کے انہیں صحیح معنی میں مسلمان بنانے کی فکر کریں۔

دار العلوم دیوبند کی بنیادی خصوصیت. جس کی بناء پر وہ بر صغیر کی دوسری درس گاہوں سے ممتاز ہوا. یہ تھی کہ وہ علم برائے علم کا ادارہ نہ تھا بلکہ انسانوں کی ایسی تربیت گاہ تھی جس سے صحیح العقیدہ سچے اور پکے مسلمان تیار ہوتے تھے. اپنی گفتار سے زیادہ کردار سے اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔

اس وقت ہمیں سب سے پہلے اپنے ماحول میں دینی مدارس کی اسی روح کو از سر نو تازہ کرنیکی ضرورت ہے کیونکہ اس کے بغیر ہماری درس گاہیں اگر بہت کامیاب ہوئیں تب بھی محض علم برائے علم کے مراکز بن کر رہ جائیں گی، مدرسے قائم کرنا اور ان میں چند لگے بندھے علوم کا درس دینا بذات خود ایک مقصد بن جائے گا جس میں بہت سے مستشرقین یورپ بھی سرگرم عمل ہیں. اور رفتہ رفتہ ہم سے سارے اوصاف گم ہو جائیں گے جو ان علوم کی درس و تدریس کے لئے لازمی شرط کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دینی مدارس میں یہ اصل روح، جو مرور ایام سے دھیمی پڑتی جارہی ہے. از سر نو تازہ کرنے کے لئے سب سے اہم ذمہ داری ان درس گاہوں کے اساتذہ اور منتظمین پر عائد ہوتی ہے ان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ پہلے اپنے ذاتی اعمال و اخلاق کا جائزہ لے کر یہ دیکھیں کہ اسلامی علوم نے ان میں اپنا کوئی رنگ پیدا کیا ہے یا نہیں؟ خوف خدا اور فکر آخرت میں کتنا اضافہ ہوا؟ اللہ کے ساتھ تعلق کتنا بڑھا؟ عبادت کے ذوق میں کتنی زیادتی ہوئی؟ جن فضائل اعمال کی دوسروں کو شب و روز تلقین کی جاتی ہے. ان پر خود کتنا عمل پیرا ہوئے؟ جس انفاق فی سبیل اللہ کی دوسروں کو بڑھ چڑھ کر تاکید کی جاتی ہے. اس میں ہم خود کس قدر حصہ دار بنے؟ دین کی خاطر جان و مال کی قربانی دینے کے جذبے نے کتنی ترقی کی؟ معاشرے کے بگاڑ سے کرب و اضطراب کی کیفیت اور اس اصلاح کی فکر کس حد تک دل و دماغ پر طاری ہوئی؟ ——یہ ساری باتیں ہمارے اپنے سوچنے کی ہیں. اور اگر ہم حقیقت پسندی کے ساتھ ان سوالات کا جواب اپنے عمل میں تلاش کریں تو ندامت و حسرت کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔

ضرورت اسی ندامت و حسرت سے کام لینے کی ہے، لیکن اس سے صحیح کام اسی وقت لیا جاسکتا ہے جب یہ ندامت و حسرت محض ایک وقتی ابال نہ ہو، بلکہ اس کا بار بار استحضار ہوتا رہے، یہاں تک کہ یہ مستقبل کے لئے نشان راہ بن جائے۔

اس غرض کے لئے یہ طریقہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تمام دینی مدارس کے اساتذہ اور منتظمین ہفتہ میں کم از کم ایک بار مل کر بیٹھیں، اور اس دن مجلس کا موضوع یہی باتیں ہوں، بہتر ہوگا کہ اس مجلس میں بزرگان دین کی کتابیں اجتماعی طور پر پڑھی جائیں جو اصلاح اعمال واخلاق کے لئے اکسیر ثابت ہو چکی ہیں، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ کے مواعظ وملفوظات اس سلسلے میں انشاء اللہ بے نظیر ثابت ہوں گے۔

دار العلوم دیو بند کے ابتدائی دور میں تقریباً تمام علماء کسی باخدا بزرگ سے استرشاد کا تعلق قائم کر کے اپنی اصلاح وتربیت کا اہتمام فرماتے تھے، یہ سلسلہ بھی عرصے سے دینی مدارس کے ماحول میں متروک سا ہو رہا ہے اسے از سر نو زندہ کرنے کی ضرورت ہے اور انشاء اللہ اس کے دور رس فوائد وثمرات نکلیں گے۔

☆

دینی مدارس کے اساتذہ اور منتظمین کے ذمہ دوسرا فریضہ ان طلباء کی تربیت ہے، جو ان کی نگرانی میں تعلیم پاتے ہیں، کچھ عرصے سے ہمارے یہاں استاد اور شاگرد کا تعلق محض ایک رسمی، خشک اور ضابطہ کا ہو کر رہ گیا ہے، استاد درس گاہ میں اپنی ڈیوٹی ادا کرنے کے بعد عموماً طلباء کی علمی وعملی کیفیت سے کوئی خاص سروکار نہیں رکھتا، یہ بات پہلے صرف جدید علوم کی درس گاہوں کے ساتھ خاص سمجھی جاتی تھی، اور دینی مدارس اس عیب سے پاک تھے، لیکن اب رفتہ رفتہ اس معاملہ میں دونوں قسم کے ادارے ایک ہی سطح پر آتے جا رہے ہیں۔

اساتذہ اور منتظمین کی سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان کے ذمہ تبلیغ دین کا جو فریضہ عائد ہوتا تھا، اللہ تعالیٰ نے اسے اتنا مختصر کر دیا ہے کہ انہیں اس غرض کے لئے در در پھرنے کی ضرورت نہیں، کچھ لوگ طالب علم کی شکل میں خود ان کے پاس چل کر آگئے ہیں، اور ان میں سے ہر ایک ایسا ہے کہ اگر اس پر محنت صرف کر کے اسے علم دین کا صحیح حامل بنا دیا جائے تو اس ایک فرد کی اصلاح سینکڑوں بلکہ ہزاروں افراد کی اصلاح کے قائم مقام ہو سکتی ہے، اس لئے اساتذہ کا فریضہ اس کے سامنے درس کی تقریر کر کے پورا نہیں ہو جاتا، بلکہ انکی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ اسکی استعداد کی نگرانی کریں، اسکے اعمال واخلاق کی تربیت کی فکر کریں اور اسے اپنی آخرت کی کھیتی سمجھ کر زیادہ سے زیادہ سنوارنے کی کوشش میں لگے رہیں۔

یہ ہیں چند وہ بنیادی باتیں، جو اکابر علماء کے ارشادات سے قدر مشترک کے طور پر ہم نے اخذ کی ہیں، باتیں اگر چہ نئی نہیں ہیں، لیکن ان کی طرف سے بے توجہی ہمارے ماحول میں عام ہو چکی ہے۔ اور اسی کو ہم تمام مفاسد کی جڑ سمجھتے ہیں، اور اگر ہم اپنے شب و روز کے معمولات میں ان باتوں کا خاطر خواہ اہتمام کر لیں اور بکرات و مرات یہ باتیں مدرسین و طلباء کے تذکرہ میں آتی ہیں تو اللہ تعالیٰ کی فضل وکرم سے امید ہے کہ ہماری بہت سی خرابیاں خود بخود دور ہو جائینگی، اور ہماری کوششیں آج کے مقابلے میں کہیں زیادہ بار آور نتیجہ خیز ثابت ہونگے۔ صحابہ کرامؓ رضوان اللہ علیہم اجمعین جو اپنے علم وعمل میں فرشتوں کے لئے بھی قابل رشک تھے اور جنکی پوری زندگیاں ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین کی صحیح ترجمان تھیں۔ وہ بھی اسکی ضرورت محسوس فرماتے تھے کہ یہ پہچانی چیزیں بار بار مذاکرہ میں آیا کریں تاکہ انکا استحضار قائم رہے اور عمل کا داعیہ سرد نہ ہونے پائے۔

حضرت ابو الدرداءؓ صحابہ میں حکیم الامت کا لقب رکھتے تھے ان سے صحابہ کرامؓ درخواست کیا کرتے تھے، کہ اجلس بنانو من ساعۃ۔ یعنی تھوڑی دیر ہمارے ساتھ بیٹھئے تاکہ ہم ایمان تازہ کرلیں۔ جب یہ خیار الخلائق اس قسم کے مذاکروں اور مجلسوں سے بے نیاز نہیں تھے تو اندازہ کیجئے کہ ہماری احتیاج اسکی طرف کتنی زیادہ ہوگی۔ مگر افسوس ہے کہ ہم اسی ضرورت سے غافل اور ہمارے ادارے اس سے خالی ہوتے جارہے ہیں۔

جہاں تک دینی مدارس کے تعلیمی نصاب اور طریق تدریس میں ترمیم کا تعلق ہے، وہ ایک مستقل موضوع ہے، اور انشاء اللہ اس موضوع پر ہم کسی اور صحبت میں گفتگو کریں گے، لیکن جو باتیں گزشتہ سطور میں عرض کی گئی ہیں انکا معاملہ نصاب کی اصلاح سے زیادہ اہم ہے، اور جب تک انکی طرف پوری توجہ نہ دیجائے کوئی بہتر سے بہتر نصاب بھی اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ اکبر آبادی مرحوم نے بڑے حکیمانہ بات کہی تھی۔

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں — آدمی، آدمی بناتے ہیں

اسلام کی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ دنیا میں یہ دین کتابوں سے زیادہ آدمیوں کے ذریعہ پھیلا ہے، اور جب تک کچھ افراد اپنی ایک ایک نقل وحرکت میں اسلام کا پیکر مجسم بنکر نہ دکھلائیں اسکی موثر تبلیغ اور تعلیم و تربیت ممکن نہیں۔ ہر آسمانی کتاب کے ساتھ کوئی نہ کوئی رسول بھی اسی لئے بھیجے گئے تھے، علم دین انہی حضرات کی میراث ہے، اور یہ میراث ان ہی کے طور طریق اختیار کئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، لن یصلح آخر ہذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا ——— !

اللہ تعالیٰ ہم سب کو علم دین کے صحیح حقوق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، ان اوصاف سے آراستہ بنائے جو خدمت دین کے لئے ضروری ہیں اور ہمارے دلوں میں ایسا اخلاص اور سینوں میں ایسی لگن پیدا

فرمادے جو ہماری زندگیوں میں انقلاب پیدا کر کے رکھ دے۔ آمین ثم آمین۔

دینی مدارس کے لئے چند تجاویز

عالم اسلام میں بلاشک وشبہ اکثریت ان افراد کی ہے جو اسلام کو ایک جیتے جاگتے نظام زندگی کی حیثیت سے دنیا میں نافذ دیکھنا چاہتے ہیں، لیکن ہر اسلامی ملک میں دو قسم کے طبقے ایسے پائے جاتے ہیں جو اس مقصد کی راہ میں سالہا سال سے رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ ایک طبقہ تو وہ ہے جو دین ومذہب سے بالکل بیزار ہے، اور زندگی کے کسی مرحلے پر اس کی رہنمائی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے کسی سیاسی غرض یا وقتی مصلحت کی بناء پر کہیں اسلام کا نام لینا پڑ جائے تو بات دوسری ہے، ورنہ دل سے وہ دین ومذہب کو ایک فالتو چیز سمجھتا ہے جس کی حیثیت اس کے نزدیک اگلے وقتوں کے افسانے سے زیادہ کچھ نہیں، اور دوسرا طبقہ وہ ہے جو دل سے تو اسلام کی ضرورت اور اہمیت کا قائل ہے اسے یکسر خاموش کر دینا اس کے بس کی بات نہیں۔ لیکن دوسری طرف وہ وقت کے چلے ہوئے افکار و نظریات سے بھی اس قدر مرعوب ہے کہ ان کے خلاف کوئی بات زبان سے نکالتے ہوئے ڈر لگتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایک شدید ذہنی کشمکش کا شکار ہے، اور یہی کشمکش بسا اوقات اس کو قرآن وسنت کی معنوی تحریف پر آمادہ کر دیتی ہے۔

یہ دونوں طبقے اگرچہ اپنی عددی قوت کے لحاظ سے اقلیت میں ہیں، اور شاید عالم اسلام کے کسی بھی ملک میں ان کی تعداد راسخ الاعتقاد مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ نہیں، لیکن شومئ اعمال سے یہی طبقے مسلمانوں کے کلیدی مقامات پر چھائے ہوئے ہیں۔ ان کو عالم اسلام کی صفوں میں جو جگہ ملی ہے وہ فکری اور عملی رہنماؤں کی جگہ ہے، اور اس طرح پوری دنیائے اسلام کی باگ ڈور عملاً ان ہی کے ہاتھوں میں ہے۔ الا ماشاء اللہ۔

اس صورت حال کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات جس نظام تعلیم سے گذر کر اپنے موجودہ مقام تک پہنچے ہیں، وہ بنایا ہی اس لئے گیا ہے کہ اس کے ذریعہ مغرب کی بالادستی کا سکہ ذہنوں پر بٹھایا جائے اور ایسے ذہن تیار کئے جائیں جو دین، مذہب، خدا اور رسول اور وحی و کتاب سے کم از کم عملی طور پر بے نیاز ہوں۔ جن لوگوں نے اس نظام تعلیم کو مدون کیا تھا، وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب رہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ۔

حضرات اقلیت میں ہونے کے باوجود عالم اسلام کے ناخدا بنے ہوئے ہیں اور ملت کا مستقبل انہی کے رحم وکرم پر رہتا ہے۔

اگر اسلامی ممالک کی اندرونی سیاست اپنی طبعی رفتار پر حرکت کرے تو یہ صورت حال بلاشبہ بدل سکتی ہے لیکن اول تو مختلف اسباب کی بناء پر یہاں کی سیاست عموماً اپنی طبعی چال سے محروم رہتی ہے۔ دوسرے واقعہ یہ ہے کہ اس مرض کا موثر، پائیدار اور اصلی علاج صرف اس طرح نہیں ہو سکتا کہ کچھ عرصے کے لئے حکومت راسخ العقیدہ مسلمانوں کے ہاتھ آجائے بلکہ اس کے لئے پرانے ذہن بدلنے اور نئے ذہن تعمیر کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے معاشرے کا سارا بگاڑ ذہن کا بگاڑ ہے۔ اور جب تک ذہن کی اصلاح نہیں ہوگی اس وقت تک اسلامی نظام زندگی کو بروئے کار لانے میں دشواریاں پیش آتی ہی رہیں گی۔

ذہن کی اصلاح وتعمیر کا اصل طریقہ تو یہ ہے کہ اپنے نظام تعلیم کا پورے قومی شعور اور صحت مند ذہن کے ساتھ جائزہ لیا جائے اور اس میں ایسی بنیادی تبدیلیاں کی جائیں جو ہمارے اجتماعی مقاصد سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ کام وقت چاہتا ہے اور اس سلسلہ میں ہم اپنی تجاویز انشاء اللہ کسی اور صحبت میں پیش کریں گے لیکن علمائے کرام کے کرنے کے کچھ ایسے ہیں جو بلا تاخیر ہو جانے چاہئیں۔ اور جن سے موجودہ صورتحال کا کچھ نہ کچھ مداوا ہو سکتا ہے۔ آج کی نشست میں ہم چند ان ہی کاموں کی طرف کچھ توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ اس وقت جتنی فکری گمراہیاں مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا سرچشمہ مغرب ہے۔ یورپ کی نشاط ثانیہ کے بعد جو فلسفہ پروان چڑھا ہے اس نے لوگوں کے سوچنے سمجھنے کے ڈھنگ میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ اب زندگی کے ہر مسئلے پر اسی طرز اور مزاج کے ساتھ غور کیا جاتا ہے جو مغرب نے گھٹی میں پلا دیا ہے۔ لہٰذا جن لوگوں کا ذہن اس خاص سانچے میں ڈھل چکا ہے۔ ان کے دلوں میں کوئی بات اتارنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ان کے طرز فکر پوری طرح سمجھا جائے۔

خلافت عباسیہ کے دور میں جس وقت یونانی فلسفہ عربی زبان میں منتقل ہوا تو اس وقت بھی علماء دین کو کم وبیش اسی قسم کی صورت حال سے سابقہ پیش آیا تھا۔ جن لوگوں نے اس فلسفے کو مرعوب ذہن کے ساتھ پڑھا۔ ان کے ذہن ودماغ پر وہی طرز فکر اور استدلال چھا گیا جو یونانی فلسفے کا پیدا کیا ہوا تھا۔ اس وقت تک قرآن وسنت کی تحریف کی جتنی تحریکیں عقلیت کے نام پر اٹھیں۔ ان کا مقابلہ اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک اس فلسفے کو نہ سمجھا جائے جو ان کے افکار کا سرچشمہ بنا ہوا تھا۔ چنانچہ اس دور کے بیدار مغز علمائے دین نے اس فلسفے کا پوری بصیرت کے ساتھ اسی زبان اور اسی طرز استدلال میں اس کا

لیکن اب وقت کے اس اہم ترین فریضہ سے صرف نظر کرنے کا بالکل وقت نہیں رہا. ہماری نئی نسل جس ذہنی ابتری اور بے راہ روی کی شکار ہے. اگر فی الواقع اس کی وجہ سے ہم دل میں کوئی درد محسوس کرتے ہیں تو ہمیں اول و آخر اس نتیجے پر پہنچنا چاہئے کہ یہ زمانہ کسی رازی" یا غزالی کی تلاش میں ہے۔ اور یہ رازی" و غزالی" کہیں آسمان سے نہیں اتریں گے یہ گوشت پوست کے انہی انسانوں میں سے پیدا ہوں گے جن میں سے پہلے پیدا ہوئے تھے. ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ جس طبقے سے ان کو پیدا ہونا چاہئے وہ طبقہ دل و جان سے ان کی ضرورت محسوس کرلے. اور انہیں حاصل کرنے کے لئے وقت اور جان و مال کی کسی قربانی سے دریغ نہ کرے

☆☆☆☆☆☆☆

(۱) سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہئے کہ ہر مدرسہ کے فارغ التحصیل طلباء یا اساتذہ میں سے چند ایسے افراد کا انتخاب کیا جائے جو علوم دین سے اچھی استعداد رکھنے کے ساتھ ساتھ تحریر و تقریر کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔ ان افراد کو انگریزی زبان سے کماحقہ. واقف کرانے کے بعد ان کے لئے مغربی فلسفہ. معاشیات. قانون اور سیاست میں سے کوئی موضوع تجویز کر دیا جائے. جس میں وہ اعلی درجہ کی مہارت حاصل کریں۔ اس دوران علوم دین سے ان کی مناسبت استوار رکھنے کے لئے تدریس کا تھوڑا بہت کام بھی ان سے لیا جاتا رہے۔ جب وہ اپنے موضوع میں تحقیقی کام کرنے کے لائق ہو جائیں تو وہ اپنے موضوع کے متعلق اسلام کی ہدایات کو جدید انداز میں پیش کرنے اور مغربی افکار کے ساتھ ان کا تقابل کرنے کی خدمات انجام دیں۔

(۲) یونانی فلسفے کو درس نظامی سے یکسر خارج کر دینا تو بہت مضر ہوگا. اس لئے کہ اس کے بغیر مقابلہ کیا. امام غزالی" اور امام رازی" جیسے بزرگوں نے یونانی فلسفے کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ اور جو لوگ اس نام نہاد عقلیت کے آگے سپر ڈال رہے تھے. انہیں فکر و نظر کی نئی راہیں دکھلائیں اسی کا نتیجہ ہے کہ تجدد اور تحریف دین کی جو تحریکیں اس فلسفے کی بنیاد پر کھڑی ہوئی تھیں ایک ایک کر کے فنا ہو گئیں. اور آج ان کا نام "الملل والنحل " جیسی کتابوں کی زینت ہو تو ہو جیتی جاگتی دنیا میں ان کا کوئی نشان باقی نہیں ہے۔

ضرورت اس بات کی تھی کہ جس طرح ماضی میں علمائے دین نے یونانی فکر کے سیلاب کا بروقت اور موثر علاج کیا تھا. موجودہ مغربی افکار و نظریات کا علاج بھی ان ہی خطوط پر کیا جاتا. علمائے کرام کی ایک بڑی جماعت مغربی فلسفے کی تہ تک پہنچ کر اسے اچھی طرح کھنگالتی. اور اس کے بعد ان شکوک و شبہات کو حل کرنے کی کوشش کرتی جو نئے ذہن میں صبح و شام کلبلاتے ہیں. مگر افسوس ہے کہ ابھی تک ایسا نہیں ہو سکا۔

متاخرین کی دینی تصانیف کو سمجھنا تقریباً ناممکن ہے. البتہ اس کی مقدار میں کمی کر کے اس کی جگہ جدید مغربی فلسفہ کو باقاعدہ داخل نصاب کیا جائے۔

(۳) فقہ کے ساتھ نئی معاشیات اور اصول قانون کو بھی داخل نصاب کیا جائے ہمیں سو فیصد یقین ہے کہ دینی مدارس میں ان موضوعات کی گریجویشن کے معیار تک پڑھانے کے لئے اس وقت کا زائد سے زائد دسواں حصہ صرف ہوگا جو ہمارے کالجوں میں اس مقصد کے لئے صرف ہوتا ہے۔

(۴) جن مدارس میں جب تک ان موضوعات کی باقاعدہ تعلیم کا بندوبست نہ ہو سکے وہاں کم سے کم اتنا کام تو فوری طور سے کیا جاسکتا ہے کہ ہفتے کے کچھ دن مخصوص کر کے ان موضوعات پر عام تقاریر کرائی جائیں جن میں ہدایہ اور اس سے اوپر کے طلباء شریک ہوں۔

یہ چند سرسری تجاویز ہیں، مزید غور و فکر سے ان کی تفصیلات طے کی جاسکتی ہیں۔ اس وقت ہمارا منشاء صرف یہ تھا کہ علمائے کرام اور ارباب مدارس کو اس رخ پر سوچنے کی دعوت دی جائے. ہمیں امید ہے کہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کیا جائے گا۔

دینی مدارس سے.......؟

شوال کے مہینے میں ملک بھر کے دینی مدارس کا تعلیمی سال شروع ہوتا ہے۔ بر صغیر کے یہ دینی مدارس جنھوں نے انتہائی ناساعد حالات میں علوم دین کی شمع روشن رکھی ہے، ہماری ملی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہیں، اور اگر یہ کہا جائے تو شاید مبالغہ نہیں ہوگا کہ بر صغیر کے مسلمانوں میں جو دینی روح نظر آتی ہے، وہ زیادتر ان بے سرو سامان مدارس اور ان کے بوریہ نشین علماء و صلحاء کی بے لوث قربانیوں کا ثمرہ ہے۔ انگریزی استعمار کے تاریک دور میں جب علم دین کے حاملین پر نہ صرف معاش کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے، بلکہ سماجی رتبے کے لحاظ سے بھی علم دین کا رخ کرنا اپنی امنگوں کا گلا گھونٹنے کے مترادف بنا دیا گیا تھا، یہ بوریہ نشین علماء ہی تھے جنھوں نے روکھی سوکھی کھا کر، موٹا چھوٹا پہن کر، اور دنیا کے تمام مروجہ لذتوں اور راحتوں سے کنارہ کر کے اپنا رشتہ قال اللہ اور قال الرسولؐ کے اس ماحول کے ساتھ جوڑے رکھا جس کے خلاف دقیانوسیت، فرسودگی اور رجعت پسندی کے طعنوں سے فضا اٹی ہوئی تھی۔

ان حضرات کے پیش نظر نہ مال و دولت کا حصول تھا، نہ جاہ و منصب کی آرزو تھی، نہ دنیا کی روزافزوں چمک دمک کا شوق تھا، دل میں لگن تھی تو بس یہی کہ خواہ قوت لایموت پر گذارا کرنا پڑے، لیکن کسی طرح اسلاف کے علوم کا ذخیرہ آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ ہو جائے، اور یہ مسلمان جنھیں دین سے برگشتہ کرنے کیلئے بڑی غیر محسوس اور مکارانہ سازشیں بر سر پیکار ہیں، اسی دین پر قائم اور باقی رہ جائیں جو سرکار دو عالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر تشریف لائے تھے، اور جس کے شجرہ طیبہ کو اس امت کے علماء اولیا کرام اور مجاہدین چودہ سو سال تک اپنے خون اور پسینے سے سینچتے رہے ہیں۔

الحمد للہ، یہ حضرات اپنی اس کاوش میں اس حد تک کامیاب ہوئے کہ انگریز اور ہندوؤں کی دہری چکی میں پسنے کے باوجود اسلام اور اس کے علوم کا ذخیرہ اپنی صحیح شکل و صورت میں محفوظ رہا، اور اپنی ہزار عملی کوتاہیوں کے باوجود بر صغیر کے مسلمان ذہنی اور فکری اعتبار سے بحیثیت مجموعی مسلمان ہی رہے۔ اور گمراہی کے راستے پر ڈالنے والے ان مسلمانوں کی اکثریت کو صراط مستقیم سے نہ بھٹکا سکے۔

لیکن مرور ایام سے جہاں ہماری زندگی کے ہر شعبے میں زبردست زوال آیا ہے وہاں ہمارے دینی مدارس بھی شدید زوال وانحطاط کا شکار ہوئے ہیں۔ اگر ہم آج کے دینی مدارس کا مقابلہ ساٹھ ستر سال پہلے کے دینی مدارس سے کر کے دیکھیں تو زمین و آسمان کا فرق اور انقلاب نظر آتا ہے۔ یہ حقیقت محتاج دلیل نہیں ہے کہ اس عرصے میں بعض دینی مدارس نے تعمیرات، ظاہری وسائل راحت اور نظم ونسق کے شعبوں میں ضرور ترقی کی ہے لیکن جہاں تک اس روح کا تعلق ہے جس پر ان مدارس کی حقیقی زندگی موقوف ہے، اس دوران اس میں ہولناک انحطاط واقع ہوا ہے۔ اسی انحطاط کا نتیجہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی زندگی پر ان مدارس کی تاثیر میں روز بروز کمی واقع ہو رہی ہے، اور اگر اس طرف کماحقہ توجہ نہ دی گئی تو حالات کے مزید ابتر ہو جانے کا خطرہ نا قابل تسخیر ہو جائیگا۔

شوال کے مہینے میں چونکہ دینی مدارس اپنے تعلیمی سال کا آغاز کرتے ہیں، اس لئے یہ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں پر غور کرنے اور اصلاح حال کا تازہ عزم کرنے کا بہترین موقع ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک نیتی کے ساتھ اپنے حالات کی اصلاح کی توفیق عطا فرمائیں آمین۔

جہاں تک راقم الحروف نے غور کیا، ہمارے انحطاط کا بنیادی سبب یہ ہے کہ رفتہ رفتہ دینی مدارس کے تعلیم وتعلم کا یہ نظام ایک رسم بنتا جا رہا ہے، اور اس کا اصل مقصد نگاہوں سے اوجھل ہو رہا ہے۔ اگرچہ ہماری زبانوں پر یہی جملہ رہتا ہے کہ ہماری تمام کاوشوں کا مقصد اصلی دین کی خدمت ہے، لیکن بسا اوقات یہ بات محض گفتار ہی کی حد تک محدود رہتی ہے، اور دل کی گہرائیوں میں جاگزیں نہیں ہوتی۔ اگر یہ مقصد واقعتہً ہمارے دل کی گہرائیوں میں جاگزین ہوتا تو اس کی لگن سے ہمارا کوئی لمحہ خالی نہ ہوتا، پھر ہمیں اپنے اسلاف کی طرح ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی کہ ہمارا کوئی عمل اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف تو نہیں، اور ہمارا طرز عمل خدمت دین اور اس کے مقصد کے لئے مفید ہو رہا ہے یا مضر؟

اس کے برعکس عملاً ہماری تمام تر توجہات دینی مدارس کے ظواہر پر مرکوز رہتی ہیں، اور ان توجہات میں مقصد اصلی کی لگن کا کوئی عکس نظر نہیں آتا۔ عموماً منتظمین کے عملی مسائل یہ ہوتے ہیں کہ کس طرح مدرسے کی شہرت میں اضافہ ہو؟ کس طرح اس میں طلبہ کی تعداد بڑھے؟ کس طرح مشہور اساتذہ کو اپنے یہاں جمع کیا جائے؟ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ کس طرح عوام میں مدرسے اور اس کے اہل حل وعقد کی مقبولیت میں اضافہ ہو؟ ہمارا طرز عمل اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ مدارس کے قیام سے ہمارے پیش نظر یہی بنیادی مقاصد ہیں جن کے حصول کی دھن میں ہمارے شب و روز صرف ہو رہے ہیں، چنانچہ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے بعض اوقات ایسے ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں جو

کسی طرح دین اور اہل دین کے شایان شان نہیں ہوتے، بلکہ بعض اوقات توان مقاصد کے لئے واضح طور پر ناجائز ذرائع کے استعمال میں بھی باک محسوس نہیں کیاجاتا، اور اگر کسی مدرسے کوان مقاصد میں فی الجملہ کامیابی حاصل ہوجائے تو یہ سمجھ لیاجاتا ہے کہ مقصد اصلی حاصل ہوگیا۔ لیکن طلباء کی تعلیمی، اخلاقی اور دینی حالت کیسی ہے؟ ہم کس قسم کے افراد تیار کر کے اس سے معاشرے کی قیادت کے خواہش مند ہیں؟ اور فی الواقعہ ہماری جدوجہد سے دین کو کتنا فائدہ پہنچ رہا ہے؟ ان سوالات پر غور کرنے اور ان کی تڑپ رکھنے والے رفتہ رفتہ مفقود ہوتے جارہے ہیں۔

اس صورت حال کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم ایک مرتبہ زبان سے اپنا مقصد اصلی خدمت دین کو قرار دینے کے بعد عملی زندگی میں اسے بھول جاتے ہیں، اور اپنی کوششوں کا تمام تر محور ان ظواہر کو بنالیتے ہیں جو یا تو شرعاً مطلوب ہی نہیں، یا اگر مطلوب ہیں تو اس شرط کے ساتھ کہ ان کو نیک نیتی سے مقصد کا محض ذریعہ قرار دیا جائے، خود مقصد نہ سمجھ لیا جائے۔

اسی طرح اساتذہ کا معاملہ عام طور سے یہ نظر آتا ہے کہ ان کا محور فکر بسا اوقات یہ رہتا ہے کہ ہمیں کونسا مضمون یا کونسی کتاب پڑھانے کے لئے ملے؟ طلبہ پر کس طرح اپنے علمی تفوق کی دھاک بٹھائی جائے؟ وہ کونسے ذرائع اختیار کئے جائیں جن سے طلبہ میں اپنی مقبولیت بڑھے؟ اور پھر اس مقبولیت میں اضافہ کی خاطر بسا اوقات یہ بات مد نظر نہیں رہتی کہ طلبہ کے لئے کونسا طرز عمل زیادہ مفید اور مناسب ہے؟ بلکہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ کیا طرز عمل طلبہ کی خواہشات کے مطابق ہے؟ چنانچہ اس کے نتیجے میں اساتذہ اپنے طلبہ کی رہنمائی کرنے کے بجائے ان کی خواہشات کے تابع ہو کر رہ جاتے ہیں، اور طلبہ اساتذہ کے پیچھے نہیں چلتے، بلکہ اساتذہ طلبہ کی خواہشات کے پیچھے چلنے لگتے ہیں۔

ماضی میں خاص طور پر دینی مدارس کی روایت یہ رہی ہے کہ استاذ اور طالب علم کا رشتہ محض ایک رسمی رشتہ نہیں ہوتا تھا جو درسگاہ کی حد تک محدود ہو، اس کے بجائے وہ ایک ایسا روحانی رشتہ ہوتا تھا جو دائمی طور پر عمر بھر قائم رہتا تھا، استاذ صرف کتاب پڑھانے کی ڈیوٹی ادا کرنے والا معلم نہیں ہوتا تھا، بلکہ وہ اپنے طلبہ کے لئے ایک مشفق باپ، ان کا اخلاقی اور روحانی مربی اور علم و عمل دونوں کے میدان میں ایک شفیق نگراں کی حیثیت رکھتا تھا جو طلبہ کے نجی معاملات تک دخیل ہوتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ طلبہ اپنے اساتذہ سے علمی استعداد کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت بھی حاصل کرتے تھے، ان سے زندگی کا سلیقہ سیکھتے تھے، ان سے للہیت، ایثار، تواضع اور دوسرے اخلاق فاضلہ اپنی زندگی میں جذب کرتے تھے اور اس طرح شاگرد اپنے استاذ کے علم و عمل کا آئینہ ہوا کرتا تھا۔

اب رفتہ رفتہ یہ باتیں داستان پارینہ ہوتی جارہی ہیں، اور وجہ وہی ہے کہ استاذ نے اپنا مقصد صرف درسگاہ میں ایک ایسی تقریر کرنے کو بنالیا ہے جسے طلبہ پسند کرسکیں، رہی یہ بات کہ کس قسم کی تقریر ان

طلبہ کے لئے زیادہ مفید ہے؟ ان طلبہ کو مفید تر بنانے کے لئے ان کو کن کاموں کا مکلف کرنا ضروری ہے؟ طلبہ کے کونسے رجحانات ان کے علم وعمل کیلئے مضر ہیں؟ ان رجحانات کو کس طرح ختم کیا جاسکتا ہے؟ طالب علم درسگاہ سے باہر جاکر کس قسم کی زندگی گزارتے ہیں؟ ان سوالات کے بارے میں سوچنے اور ان مقاصد کی لگن رکھنے والے۔ الاماشاء اللہ۔ مفقود ہوتے جارہے ہیں۔

دار العلوم دیوبند اور اس کے فیض یافتہ دوسرے دینی مدارس کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ انھوں نے صرف "علم برائے علم" کو کبھی مقصد نہیں بنایا۔ چنانچہ وہاں کے تمام طلبہ درسیات سے فراغت کے فوراً بعد کسی شیخ کامل سے اصلاح وتربیت کا تعلق قائم کرتے تھے آج علماء دیوبند کی فہرست میں جن اصحاب کے اسماء گرامی اپنی علمی کارناموں کیلئے معروف اور ممتاز ہیں، وہ سب کسی نہ کسی بزرگ سے اصلاحی تعلق رکھتے تھے۔

دار العلوم دیوبند کے عہد شباب میں کسی ایسے استاذ کا تصور تقریباً ناممکن تھا جو کسی شیخ کامل سے وابستہ نہ ہو۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اساتذہ صرف علمی استعداد ہی نہیں، بلکہ کردار وعمل اور ذہن وفکر کے لحاظ سے اپنے طلباء کے لئے ایک مثالی نمونہ کی حیثیت رکھتے تھے، ان کے دل للہیت کے جذبے سے سرشار، ان کے جذبات پاکیزہ، ان کے اخلاق جلا یافتہ، اور ان کے ذہن دنیا طلبی اور جاہ پرستی کے فتنوں سے پاک ہوتے تھے، اور وہ صرف اللہ کی رضاجوئی کی خاطر درس وتدریس کی خدمات انجام دیتے تھے۔

افسوس ہے کہ اب دینی مدارس اور ان کے فارغ التحصیل حضرات میں اپنی اصلاح وتربیت کیلئے کسی شیخ کامل سے رجوع کرنے کا ذوق ختم ہوتا جارہا ہے، بلکہ بہت سی جگہوں پر سلوک وتصوف اور تربیت وارشاد کے سلسلے کو مد فضول سمجھ لیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ طلباء فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے آپ کو کسی تربیت کا محتاج نہیں سمجھتے، اور جب اس ناپختگی کے عالم میں اپنی پختگی کا زعم باطل لیکر عملی زندگی میں داخل ہوتے ہیں، یا دوسروں کی رہنمائی کا منصب سنبھالتے ہیں تو "او خویشتن گم است کرا رہبری کند" کا منظر سامنے آتا ہے۔

ان گزارشات کا مقصد خدانخواستہ تنقید برائے تنقید نہیں، بلکہ ان حقیقی مسائل کی طرف توجہ دلانا ہے جن سے ہم دوچار ہیں، اگر مدارس کے اہل حل وعقد ان مسائل کی طرف کماحقہ توجہ دیں تو اب بھی اس صورت حال کا مداوا ہو سکتا ہے۔ تجربہ یہ ہے کہ ان باتوں کا بار بار تذکرے سے بھی اصلاح حال میں مدد ملتی ہے، لہٰذا ہم اہل مدارس سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ تعلیمی سال کے آغاز میں ان مسائل پر غور وفکر کے لئے اساتذہ کی مجلس منعقد کریں جن میں ان حالات کا تجزیہ کر کے ان اسباب کو دور کرنے اور اصلاح کی تدابیر کرنے پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔

تجربہ یہ بھی ہے کہ ان حالات کی اصلاح کے لئے اپنے بزرگوں کے حالات اور ملفوظات کا مطالعہ اور مذاکرہ بھی بہت مفید ثابت ہوتا ہے. اس لئے ہماری تجویز یہ ہے کہ ہر مدرسے میں کچھ وقت اس مذاکرے کیلئے مخصوص کیا جائے. اور اس میں علامہ زرنوجیؒ کی "تعلیم المتعلم" علامہ خفاجیؒ کی "تذکرۃ السامع والمتکلم" حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی "ارواح ثلاثہ" شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی "فضائل علم" اور "آپ بیتی" اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے مختلف مواعظ وملفوظات کا اجتماعی طور پر مطالعہ کیا جائے۔ ضرورت تو اس کی ہے کہ یہ مذاکرہ روزانہ ہوا کرے. لیکن اگر ایسا کرنا مشکل ہو تو کم از کم ہفتے میں ایک بار پابندی کے ساتھ اس مذاکرے کی مجلس منعقد ہو. اور اس میں اساتذہ وطلبہ سب شریک ہوں. امید ہے کہ انشاء اللہ یہ مجلس اصلاح احوال میں نہایت موثر ثابت ہوگی. اور اپنے اسلاف کی باتیں بار بار کانوں میں پڑیں گی تو اس سے انشاء اللہ جذبہ عمل خود بخود پیدا ہوگا۔

اس کے علاوہ ہر مدرسے میں طلبہ کی دینی واخلاقی نگرانی کا ایسا نظام قائم کرنے کی ضرورت ہے. جس سے خود کار طریقے پر طلباء کی تربیت ہو سکے۔ اساتذہ کو اس بات کا خوگر بنانے کی ضرورت ہے کہ وہ صرف درسگاہ کی حد تک نہیں. بلکہ اس کے باہر بھی طلبہ کی حالات کو نگاہ میں رکھیں اور ان کی تربیت کو اپنے فرائض منصبی میں شامل سمجھیں۔

اخلاق کے شعبے کو ہمارے نظام تعلیم میں جس طرح خارج از بحث کر دیا گیا ہے اس کی طرف بھی توجہ دینا ضروری ہے. اخلاقیات کی تعلیم وتربیت کو نصاب کا باقاعدہ جزء ہونا چاہئے۔ مقام شکر ہے کہ وفاق المدارس العربیہ نے اب جو نیا نصاب مقرر کیا ہے اس میں اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر تمام مدارس اس اضافے کو پوری اہمیت کے ساتھ اپنے نظام تعلیم میں شامل کرلیں تو انشاء اللہ وہ بھی اصلاح احوال میں ممد ومعاون ہوگا۔

یہ چند بے ربط سی باتیں اس مسئلے کی طرف متوجہ کرنے کے لئے سپرد قلم کی گئی ہیں تمام اصحاب مدارس ان کی طرف توجہ دیں گے تو انشاء اللہ اصلاح کے اور بھی راستے سامنے آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اسلاف کی اس امانت کو خوش اسلوبی کے ساتھ محفوظ رکھنے اور ترقی دینے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

وما علینا الا البلاغ

(ماہنامہ "البلاغ" شوال ۱۴۰۳ھ ج ۱۷ ص ۵۷۹)

ملفوظات محی السنت حضرت مولانا ابرار الحق صاحب ہردوئی دامت برکاتہم

خلیفہ حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ______

مرتبہ ______ حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب ___

حضرت مولانا ابرار الحق صاحب ہردوئی کو اللہ تعالیٰ نے ایسی خاص شان اصلاح سے نوازا ہے اور پھر اصلاح امت کے کام کو ان کے لیے اس طرح درد دل بنا دیا ہے کہ ان کی مثال ڈھونڈنے سے بھی کہیں نہیں ملتی اللہ تعالیٰ اصلاح منکرات کا جو کام حضرت والا سے لے رہے ہیں وہ دنیا میں کہیں نظر نہیں آتا ، مجالس ابرار انہی کے ارشادات کا مجموعہ ہے ______ مجالس ابرار :- قرآن وحدیث کے انمول خزانوں ، بزرگوں کے حیرت انگیز واقعات ، اتباع سنت اور اصلاح امت کے آسان نسخوں سے مزین ہے ______ مجالس ابرار :- وعظ و تقریر اور نصیحت میں ایک بلند پایہ کتاب ہے جو واعظین مقررین خطباء اور ائمہ مساجد کے لیے ایک گراں قدر تحفہ ہے۔

______ تاثراتِ اکابر ______

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے فرمایا :- آج کانوں میں ان باتوں کی آواز آرہی ہے جو ہم تھانہ بھون میں سنا کرتے تھے۔ حضرت مولانا یوسف صاحب بنوری نے فرمایا :- مجھے مولانا سے قلبی لگاؤ اور تعلق ہے اور میں مولانا سے بہت متاثر ہوں۔ حضرت شاہ عبد الغنی صاحب پھولپوری نے فرمایا :- مولانا کی انتظامی شان دیکھ کر معلوم ہوا کہ یہ سلطنت بھی چلا سکتے ہیں، حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الحی صاحب نے فرمایا :- کہ مجھے مولانا کے علوم سے اور وعظ سے نہایت خوشی ہوئی ۔ حضرت بابا انجم احسن نے فرمایا :- یہ مولانا یادگار حکیم الامت ھیں۔

ملّا اور دینی مدارس

چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر جنرل ضیاء الحق صاحب نے اپنی پریس کانفرنس میں دینی مدارس کا بھی ذکر فرمایا ہے اور واضح الفاظ میں یہ اعلان کیا ہے کہ حکومت ان مدارس کو اپنی تحویل میں لینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی، البتہ ان مدارس کی "پشت پناہی" اور ان کی اعانت کو اپنا فرض سمجھتی ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ ان مدارس کو محض "ملاؤں کے مدارس" نہیں رہنا چاہئے، بلکہ ان میں جغرافیہ، تاریخ، ریاضی اور سائنس جیسے مضامین بھی داخل کرنے چاہیں۔

جو حضرات "البلاغ" کے اداریئے باقاعدگی سے پڑھتے ہیں، وہ اس بات سے واقف ہوں گے کہ دینی مدارس کو زیادہ مفید اور موثر بنانے کے لئے ہم نے ہر معقول تجویز کا ہمیشہ خیر مقدم کیا ہے، بلکہ وقتاً فوقتاً اصحاب مدارس کی خدمت میں خود بہت سی تجاویز پیش کرتے رہے ہیں، جن میں موجودہ ضروریات کے مطابق نصاب میں ترمیم اور بعض مضامین کا اضافہ بھی شامل ہے لیکن یہ مسئلہ بڑا نازک اور سنجیدہ غور و فکر کا محتاج ہے، اور یہ اسی وقت صحیح طور پر حل ہو سکتا ہے جب اس کو اسی سنجیدگی، ہمدردی اور معاملہ فہمی کے ساتھ حل کیا جائے جسکا وہ مستحق ہے۔

کسی بھی ادارے یا نظام کے بارے میں اصلاحی تجاویز کی عام طور سے دو صورتیں ہوتی ہیں، ایک صورت تو یہ ہے کہ پہلے اس ادارے یا نظام کو قریب سے دیکھ کر اس کے بنیادی مقاصد اسکے طریق کار اور اس کے عملی مسائل کا پوری ہمدردی کے ساتھ بے لاگ جائزہ لیا جائے، اسکی خوبیوں اور خرابیوں کو کماحقہ، پرکھا جائے، اور اس کے بعد اسکی خرابیاں دور کرنے کے لئے تجاویز طے کی جائیں، اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس ادرے یا نظام کو قریب سے دیکھے سمجھے بغیر محض اس تاثر کی بنیاد پر کوئی بات کہہ دی جائے جو اس کے مخالفین نے لوگوں میں پھیلا دیا ہے۔ دینی مدارس کی مظلومیت یہ ہے کہ عام طور سے ان پر تنقید یا انکے لئے تجاویز مرتب کرتے وقت پہلی صورت کے بجائے دوسری صورت اختیار کی جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دینی مدارس میں جہاں، بہت سی باتیں فی نفسہا اصلاح طلب ہیں، وہاں ایک طویل

فہرست ان ناکردہ گناہوں کی بھی ہے جو علماء، اسلامی علوم اور دینی درسگاہوں سے خدا واسطے کا بیر رکھنے والوں نے باقاعدہ گوئیلز کی پالیسی کے تحت دنیا بھر میں مشہور کر دیئے ہیں اور اصل واقعہ یہ ہے کہ برصغیر میں مغربیت کے سیلاب کو جس موثر ترین مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہے اس کا سبب یہی "رسوائے زمانہ" دینی مدارس تھے چنانچہ جہاں جہاں یہ "بے رنگ و آب" درسگاہیں موجود تھیں، وہاں وہاں مغربی افکار کا اثر سب سے کم ہوا یہاں تک کہ دو سو سال کے طویل عرصے میں ہر طرح کی سازشوں، کاوشوں اور دنیا بھر کے وسائل استعمال کرنے کے باوجود مغربیت کو شاید سب سے کم کامیابی اسی برصغیر کے علاقے میں حاصل ہوئی۔ اس بنا پر یہ مدارس انگریزی استعمار، مغربی فکر اور مغرب پرستوں کی نگاہ میں ہمیشہ کانٹے کی طرح کھٹکتے رہے ہیں، اور انھوں نے ان مدارس کو بدنام کرنے، ان کا مزاق اڑانے اور ان پر طرح طرح کے الزامات عائد کرنے میں کوئی وقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، یہاں تک کہ یہ الزامات رفتہ رفتہ لوگوں کے ذہن میں ایسے مسلمات کی صورت اختیار کر گئے جنکی تحقیق و تفتیش کی بھی کوئی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔

اس ذہنیت کے حامل حضرات کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے تو وہ دشمنوں کے پھیلائے ہوئے اس تاثر کی بنا پر ذہن میں یہ فرض کر لیتے ہیں کہ یہ دینی مدارس یکسر بے مصرف، بیکار اور لایعنی ادارے ہیں جنھوں نے ملت میں دقیانوسیت اور تنگ نظری کی آبیاری کے سوا کوئی خدمت انجام نہیں دی، اس کے بعد وہ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق ان اداروں کو مختلف مشوروں سے نوازتے رہتے ہیں جنکی فہرست تو بہت طویل ہے، لیکن ان کے بین السطور ان مدارس کے استخفاف کا پہلو ایک قدر مشترک کے طور پر نمایاں ہوتا ہے۔

ظاہر ہے اس قسم کی تجاویز اور مشوروں کا کوئی عملی فائدہ ظاہر نہیں ہوتا، اور نہ ہونا چاہئے، کیونکہ یہ مشورے ان اداروں کے اصل مقصد وجود، ان کی واقعی خدمات اور انکی مطلوبہ اغراض سے صرف نظر کر کے دیئے جاتے ہیں اور خواہ ان کا محرک اخلاص ہی ہو، لیکن چونکہ وہ ان مدارس کے قریبی مشاہدے پر مبنی نہیں ہوتے، اس لئے ان کے پس منظر میں وہی پروپیگنڈا جھلکتا نظر آتا ہے جسکا اہتمام انگریزی استعمار اور اس کے حاشیہ نشینوں نے کیا تھا۔

ہمیں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق صاحب کی نیک دلی اور علم دوستی سے پوری توقع ہے کہ انھوں نے دینی مدارس کے بارے میں سوچتے وقت اس معاندانہ پروپیگنڈے کا یقیناً کوئی اثر نہیں لیا ہو گا، بلکہ انکی اصلاحی تجاویز اسی پہلی صورت سے متعلق ہوں گی جس کا ذکر ہم نے شروع میں کیا ہے۔ اور ان کا مقصد یہی ہو گا کہ ان مدارس کے مسائل کی حقیقت پسندی اور ہمدردی کے ساتھ قریبی جائزہ لینے کے بعد ان کے نصاب و نظام میں جو امور واقعتاً اصلاح طلب ثابت ہوں ان کی اصلاح کے طریقے سوچے جائیں لہٰذا ہم ان کے اس جذبے کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

البتہ موجودہ حالات میں دینی مدارس کے لئے جنرل ضیاء صاحب موصوف نے "ملاؤں کے مدارس" کی جو اصطلاح استعمال کی ہے، اس پر ذہنوں میں یہ خلجان ضرور پیدا ہو رہا ہے کہ اس موجودہ دینی مدارس کی تنقیص، بلکہ کسی حد تک تحقیر کا پہلو نکلتا ہے۔

واقعہ تو یہ ہے کہ "ملا" کا لفظ انتہائی اعزاز و اکرام کا لفظ تھا، اور یہ خطاب، ماضی میں ان دانشوروں کو دیا جاتا تھا جن کا علم و فضل اور ورع و تقویٰ اور جنکی تحقیقی خدمات اور بلند کرداری مسلم ہو۔ چنانچہ ماضی میں جن حضرات کو یہ خطاب دیا گیا ان میں "ملا علی قاری" "ملا عبدالرحمٰن جامی، ملا نظام الدین سہالوی" ملا عبدالحکیم سیالکوٹی" اور نہ جانے کتنے اصحاب فضل و کمال شامل ہیں جنکی علمی اور تحقیقی خدمات نے ایک دنیا کو سیراب کیا ہے۔ لیکن جب عالم اسلام پر مغربی استعمار نے اپنا شکنجہ کسا تو اس کے مذموم عزائم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی "ملا" بنے یہ وہ واحد مخلوق تھی جس نے کسی بھی محاذ پر کبھی ایک لمحے کے لئے بھی مغرب کی بالادستی تسلیم نہیں کی جس نے نہ کبھی مغرب کی سیاسی غلامی کو قبول کیا، نہ ذہنی غلامی کو، اور جسے اپنی ملی روایات کے تحفظ سے نہ سونے کی زنجیریں باز رکھ سکیں نہ لوہے کی بیڑیاں۔ چنانچہ ان بوریہ نشینوں نے معاش کے تمام دروازے بند ہونے کے باوجود روکھی سوکھی کھاکر، موٹا چھوٹا پہن کر اور دنیوی خوشحالی کے تمام وسائل تج کر ہر سیاسی اور فکری محاذ پر مغربی استعمار کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، اور اس کی سازشوں کے مقابلے میں آہنی دیوار بن گئے۔

ظاہر ہے کہ ایثار و سرفروشی کے یہ پیکر اس مغربی استعمار کو کیسے پسند آسکتے تھے جو برصغیر کو تادم زیست اپنا سیاسی اور ذہنی غلام بنانے کے لئے توپ سے لیکر زر و جواہر تک اور عیسائی مشنریوں سے لیکر میکالے کے نظام تعلیم تک ہر حربہ آزمانا چاہتے تھے۔ درحقیقت ان کے مقصد کی تکمیل کا ایک ہی راستہ تھا، اور وہ یہ کہ یہ "ملا" جو اس کے ہر منصوبے میں کھنڈت ڈالنے کے لئے ہر وقت کمربستہ رہتے ہیں، انھیں خود مسلمانوں کے درمیان صرف بدنام ہی نہیں، ذلیل و خوار کر کے چھوڑیں، تاکہ عوام رفتہ رفتہ خود ان کی عزت و احترام اور ان کی پیروی کے جذبے کو دل سے نکال پھینکیں، اور مغربی افکار کو کھل کھیلنے کے میدان خالی ملجائے۔ اقبال مرحوم نے مغربی استعمار کی اسی فکر کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روح محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو
فکر عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
افغانیوں کی غیرت دیں کا ہے یہ علاج
"ملا" کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو

چنانچہ "ملا" کو ایک باقاعدہ سوچی سمجھی سازش اور باقاعدہ منصوبے کے تحت اس بری طرح بدنام کیا گیا. اس کے خلاف ایسے ایسے الزامات تراشے گئے، اور اس کے تمسخر و استہزاء کی ایسی مہم چلائی گئی کہ یہ لفظ جو علم و ہنر اور فضل و کمال کا نشان تھا رفتہ رفتہ گالی بنکر رہ گیا۔ اہل علم کے بھیس میں جو دنیا پرست لوگ ہر دور میں موجود رہتے ہیں، انھوں نے اس مہم کو مزید فائدہ پہونچایا، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج یہ لفظ خود مسلمانوں میں معاذ اللہ تحقیر و تذلیل کے انداز میں استعمال ہونے لگا ہے۔

اسلئے واقعہ یہ ہے کہ اصلاً تو ہمیں اپنے لئے "ملا" کا خطاب قابل فخر محسوس ہوتا ہے، بلکہ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح معنی میں ویسا ہی "ملا" بننے کی توفیق عطا فرمائے جیسے ملا علی قاری" وغیرہ پچھلے زمانے میں گزرے ہیں۔ لیکن انگریزی سازش کے زیر اثر اس لفظ کا جو حشر بنا ہے. اور جس سیاق و سباق میں وہ بولا گیا ہے اس کے پیش نظر جنرل صاحب کی تقریر میں اس کا استعمال ان لوگوں کو شدت سے کھٹکا ہے جو ان مدارس اور حالات اور مسائل سے قریبی واقفیت رکھتے ہیں۔

خیر! یہ ایک لفظ و اصطلاح کی بات تھی، لیکن جہاں تک دینی مدارس کے نصاب و نظام میں اصلاح کا تعلق ہے اس کے بارے میں ہم پہلے ہی یہ عرض کر چکے ہیں کہ ان مدارس کے مقصد وجود، انکی واقعی خدمات اور ان کے عملی مسائل کو مد نظر رکھتے ہوئے اصلاح و تعلیم کی جو بھی ہمدردانہ کوشش کی جائے گی، یہ ادارے اس کا تہ دل سے خیر مقدم کریں گے، کیونکہ اصلاح و ترمیم کی ضرورت خود ان اداروں کے اصحاب بھی عرصے سے محسوس کر رہے ہیں۔ بس شرط یہ ہے کہ اول تو یہ کام کسی پروپیگنڈے کے زیر اثر نہ کیا جائے، بلکہ حقیقی مسائل کو صحیح طریقے سے پرکھ کر کیا جائے، دوسرے یہ کہ جن لوگوں نے ان اداروں کے لئے اپنی عمریں وقف کی ہوئی ہیں جو ان کے حقیقی مسائل سے واقف ہیں، اور جنھوں نے کٹھن سے کٹھن حالات میں ان مدارس کے بنیادی مقصد، ان کی روح، انکے مزاج و مزاق اور ان کی آزادی فکر کا تحفظ کیا ہے، ان کو نہ صرف اعتماد میں لے کر یہ کام کیا جائے، بلکہ انہی کے ہاتھوں اسے انجام دلوایا جائے۔

لہٰذا اس طویل گزارش کا منشاء یہ ہے کہ اگر ان دینی مدارس کے بارے میں کچھ ہمدردانہ تجاویز حکومت کے ذہن میں ہیں اور وہ انھیں روبعمل لانا چاہتی ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ان مدارس کے اکابر اور ذمہ داروں کو جمع کر کے ان سے مشورہ کرے اور ان کے مشوروں ہی سے کوئی عملی قدم اٹھائے۔

جہاں تک دینی مدارس میں کچھ نئے مضامین کے اضافے کا تعلق ہے، اصولی طور پر ہم شروع سے اس تجویز کے حامی ہیں لیکن اس تجویز کے عملی پہلو بھی قدرے تفصیل چاہتے ہیں، اور زندگی رہی تو انشاء اللہ ان پر آئندہ صحبت میں مفصل گفتگو ہوسکے گی۔ وما علینا الا البلاغ

دار العلوم دیو بند

ایک مثالی دینی درس گاہ

دار العلوم دیو بند بر صغیر میں مسلمانوں کی ایسی درس گاہ ہے، جو فرنگی اقتدار کے بڑھتے ہوئے
طوفانوں کا مقابلہ
کر کے منصب شہود پر جلوہ گر ہوئی تھی، یہ دین وتقویٰ اور علم وعرفان کی ایسی جلوہ گاہ ہے
جس نے مسلمانوں کے دلوں کو جگایا اور ایسے فرزندان توحید پیدا کیے، جو
آسمان دین ودانش کے ماہ وانجم بن کر آج بھی قلوب
انسانی پر ضوفشاں ہیں
ذیل کا مضمون اس درس گاہ کے صد سالہ جشن کے موقع پر رقم کیا گیا ہے!

آفتاب کی ارغوانی شعاعیں ابھی دیو بند کی وادیوں میں پوری طرح پھیلی نہ تھیں کہ فلک کی آنکھ نے یہ منظر دیکھا کہ بستی کے ایک گوشے میں چند لوگ جمع ہیں۔ یہ پرستاران توحید تھے۔ یہ صلحائے امت تھے اور ناموس دین کے نگہبان تھے۔ ان کے سینوں میں عشق الٰہی کی آگ بھڑک رہی تھی ان کی آنکھیں نم آلود تھیں ان کے دل کی دھڑکنیں تیز تھیں ان کے نورانی چہروں سے عزم وثبات کے چشمے پھوٹ رہے تھے ان میں کا ہر ایک علوم نبوت کا رمز شناس اور دین حق کا شیدائی تھا۔

یہ سعید ہستیاں یہاں کیوں جمع ہیں؟ یہ سوال ہے جو افق دین پر ابھرتا ہے۔ آیئے ایک طائرانہ نگاہ حقیقت حال پر ڈالیں۔

یہ بر صغیر میں انیسویں صدی کے وسط کا دور ظلمت ہے۔۔۔۔ جب اسلام کی عظمت وشکوہ کا مہر نیم روز ڈوب چکا تھا البتہ اس کی ہلکی ہلکی کرنیں اپنے دھندلے نقوش کی جھلکیاں دکھا رہی تھیں۔۔۔۔ مسلمانوں کی حکومت واقتدار کی وہ شمع جو صدیوں سے فروزاں تھی، اس کا نقشہ غالب کی زبان میں یہ تھا "اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے"۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے زمام حکومت چھن گئی تھی۔ ان کا اقتدار اپنی زندگی کی آخری سانس لے رہا تھا۔ اسلام کی شوکت وتجمل کا نیر اعظم غروب ہو رہا تھا اسلامی تہذیب کے نقوش مٹنے لگے تھے۔ شعائر اسلامی نگاہ سے اوجھل ہوتے جا رہے تھے دینی تعلیم گاہیں ویران ہو گئی تھیں

___ اور خانقاہیں سنسان تھیں۔ مسلمانوں کے چہروں پر اداسی تھی اور دل پر غم اندوہ کے بادل لا رہے تھے۔ دینی شعور محو ہو رہا تھا۔ سنت نبوی مردہ ہو رہی تھی اور گمراہی اور ضلالت کے بھیانک سائے تیزی سے پھیل رہے تھے۔ شرک و بدعات نے سر اٹھالیا تھا۔ دین کی اصل صورت مسخ ہونے لگی تھی۔ الحاد و بے دینی کی باد سموم چلنے لگی تھی۔ چمنستان اسلام پر خزاں کا رنگ آ رہا تھا اور مرغان خوشنوا اپنی نوائے شیریں بھول گئے تھے۔

یہ تھا وہ دلفگار نقشہ جسے یہ مقدس ہستیاں دیکھ رہی تھیں۔ اور وہ اپنے سینوں میں ایک خلش ایک اضطراب اور ایک عزم لے کر اس گوشہ میں جمع ہوئی تھیں۔ یہ بزرگ سوچ رہے تھے کہ کس طرح احیائے دین کا کام کیا جائے اور کس عنوان سے بقائے سنت کی تدبیر کی جائے وہ سب فکر و خیال کے عمیق سمندر میں غوطہ زن تھے اور اپنے تصرف باطنی اور نور بصیرت سے مسئلہ کا حل تلاش کر رہے تھے آخر کار نصرت خداوندی اور عون ایزدی سے وہ اس بات پر متفق اور ہم خیال ہو گئے کہ علوم نبوت کے احیاء کے لئے ایک "دبستان علم و آگہی" کی داغ بیل ڈالی جائے۔ ان کا یقین تھا کہ یہی وہ طریقہ ہے جس سے مسلمانوں کے قلب و دماغ کی تیرگی دور کی جا سکتی ہے اور اسلام کی شعاعیں پھیلائی جا سکتی ہیں۔ اسی کے ذریعہ سینوں میں علم و عرفان کی شمعیں روشن ہو سکتی ہیں اور اسی کے ذریعہ مردہ رگوں میں نور ایمانی گردش کر سکتا ہے اور اسی سے ابو بکرؓ۔ عمرؓ۔ علیؓ و عثمانؓ طلحہؓ وزبیرؓ۔ خالدؓ و طارقؒ الف ثانیؒ۔ اور ولی اللہؒ کی روح پرور اور ایمان افروز زندگی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر سکتا ہے۔

یہ صالح ہستیاں منتخب روزگار تھیں ___ خدا رسیدہ تھیں انہیں نور بصیرت حاصل تھا۔ یہ عرفان شریعت سے آراستہ تھیں اور یہ اس کا مومنانہ فراست حکیمانہ صلاحیت اور ملہمانہ بصیرت کا کرشمہ تھا کہ خداوند قدوس کے حکم سے دیوبند کی خاک پر علوم نبوت کی ایک درس گاہ عالم وجود میں آ گئی بادی النظر میں یہ ایک حقیر درسگاہ تھی۔ لیکن فی الحقیقت یہ علوم معرفت کا عظیم سرچشمہ تھا اس میں بڑی جامعیت تھی۔ بڑی ہمہ گیریت تھی یہ ایک دانش کدہ تھا۔ یہ علم و عرفان کا مرکز عظیم اور دین و تقویٰ کا مظہر جلیل تھا فکر و عمل کی بہترین جلوہ گاہ تھی اور اس طائفہ ولایت کے سرخیل حجتہ الاسلام حضرت محمد قاسم نانوتویؒ تھے، کون محمد قاسم؟ جو اشارہ ربانی کے رمز شناس تھے جن کے باطنی محاسن اور جن کے اخلاقی مکارم نے کفر کی ظلمتوں کا سینہ چیر کر اس میں نور ایماں پیوست کیا اور جن کے باطنی شعور اور فکری بلوغ سے ظلمت کدہ ہند میں وحی الٰہی کی روشنی پھیلانے کا اہتمام ہو رہا تھا ___ پھر یہ اسلام کا بطل جلیل تنہا نہ تھا اس کی معاونت کے لئے دیگر رجال کار بھی تھے وہ کون؟ وہ حاجی سید عابد حسین تھے وہ مولانا ذوالفقار علی تھے، وہ مولانا فضل الرحمٰن تھے۔ یہ وہ بندگان خدا تھے جن کی اصابت فکر، جن کی جلالت علم اور جن کی فراست و فہم پر ماہ و پرویں گواہ تھے۔

پھر یہی برصغیر کی وہ عظیم دبستان تھی جس سے علوم نبوت کے چشمے پھوٹے اور خزاں رسیدہ چمنستان وطن کی آبیاری کا آغاز ہوا پھر گل ولالہ میں تازگی آئی اور برگ وبار میں بالیدگی پیدا ہوئی اور دار العلوم کے بانی کا یہ خواب ایک حقیقت بنکر جلوہ گر ہو گیا کہ

"میں خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور میرے ہاتھوں اور پیروں کی دسوں انگلیوں سے نہریں جاری ہیں اور اطراف عالم میں پھیل رہی ہیں"

پھر یہی خاک دیوبند ہے جہاں سے مجاہدین اسلام کا ایک کارواں گزرا تھا جس کے سرخیل حضرت احمد شہید بریلوی" تھے اور جس کی زبان سے یہ ملہمانہ کلمات نکلے تھے۔

"مجھے اس مٹی سے علم کی خوشبو آتی ہے۔"

سید شہید" کی یہ پیشین گوئی سچی ثابت ہوئی اور آج دیوبند کی خاک ایک سدابہار گلشن عام بنکر جلوہ گر ہے اور اس کی مہک سے سارا عالم معطر ہے یہی وہ درس گاہ ہے جس نے فرنگی حکمرانوں کی عیارانہ چالوں کا چیلنج قبول کیا اور لارڈ میکالے کی اس معاندانہ روش کا مقابلہ کیا۔ جس نے ایسی تعلیمی منصوبہ بندی کی تھی جس کا مقصود ایسی نسل تیار کرنا تھا جو رنگ ونسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو اور دل ودماغ کے لحاظ سے انگریز چنانچہ اس مذموم مقصد کے خلاف صلحائے امت نے یہ قدم اٹھایا کہ ایسی تعلیمی اسکیم تیار کی تھی جس سے ایسی نسل تیا ہو سکے جو رنگ ونسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو اور دل ودماغ کے اعتبار سے اسلامی ہو۔"

پھر ایک حسین ودلنواز صبح طلوع ہوئی، جب دیوبند کی مسجد کے صحن میں یہ منظر انسانی آنکھوں نے دیکھا کہ ایک انار کے درخت کے سائے میں ایک استاد، ایک شاگرد کو "علوم نبوت" کا درس دے کر ایک عظیم الشان درس گاہ کی افتتاحی تقریب انجام دے رہا ہے۔ استاد کا نام بھی محمود ہے اور شاگرد کا بھی محمود ــــ پھر بزرگان ملت اور صلحائے امت کی نیت کا خلوص ان کا ولولہ دینی، ان کا جوش ایمانی۔ ان کی بے پناہ قربانی، ان کی جذبہ خدمت کی فراوانی نے دنیائے اسلام میں غلغلہ پیدا کر دیا۔ صغیر کے مسلمانوں میں بڑا انقلاب آیا ذہنی ابتذال وانحطاط دور ہونے لگا، دل کی بجھی ہوئی شمعیں پھر روشن ہونے لگیں، پھر سینوں میں عزائم بیدار ہونے لگے، توحید ورسالت کے امین ونگہبان پھر سربلند ہو کر دنیا میں نظر آنے لگے۔ دانش کدوں کے بند دروازے پھر کھل گئے۔ خانقاہوں کی رونق پھر واپس آگئی اور پھر ۱۲۸۲ھ سے لے کر ۱۳۸۲ھ تک دیوبند کے منبع عرفان نے ایسے بے شمار فرزندان توحید پیدا کئے جو دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل گئے اور جو آسمان شہرت پر مہروماہ بن کر چمکے اور جن کی تبلیغی اور علمی سرگرمیوں نے بے شمار مخلوق خدا کو کفر کی ظلمت سے نکال کر ایمان کا نور عطا کیا۔

اور یہ علمائے دیوبند ہی ہیں جن کی علمی جلالت اور سیاسی بصیرت اور جذبہ حریت اور فکری جودت

نے برصغیر کو فرنگی آقاؤں کی غلامی سے نکال کر عروس آزادی سے ہمکنار کیا۔ بلاشبہ آج پوری دنیائے اسلام دبستان دیوبند کی مرہون منت ہے چنانچہ ہزاروں فضلاء علماء مفسرین ومحدثین، متکلمین ومترجمین اقصائے عالم سے کھنچ کھنچ کر اپنا خراج عقیدت ادا کرنے کے لئے اس کے صد سالہ جشن کی شرکت کی مسرت حاصل کر رہے ہیں۔

ہمارا معاشی نظام

یہ کتاب بھی مفتی اسلام حضرت مولانا تقی عثمانی کے شگفتہ قلم کی مرہون منت ہے، عصر حاضر میں اسلام کے عملی نفاذ اور زندگی کے مختلف شعبوں میں نت نئے پیدا ہونیوالے مسائل اور انکے اسلامی حل کے سلسلہ میں مفتی اسلام حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب برابر لکھتے رہتے ہیں یہ کتاب بھی انہی مسائل پر ایک عظیم کلیدی حیثیت کی حامل ہے جسکا اندازہ آپ کو درج ذیل عنوانات سے بخوبی ہو جائے گا۔

ہمارا معاشی نظام
اسلامی نظام کے تحت معاشی اصلاحات
علماء کا متفقہ معاشی خاکہ
ہمارے معاشی مسائل اور ان کے حل کی مختلف تجاویز
سوشلزم اور غریب عوام
اسلام، جمہوریت اور سوشلزم
سوشلزم اور معاشی مساوات
سوشلسٹ اعتراضات
زرعی اصلاحات

سوالنامہ ربا کا جواب
غیر سودی کاونٹرز
بچت کا ہفتہ اور حکومت کی مالی اسکیمیں
مشارکہ کی نئی اسکیم
غیر سودی بینکاری، چند تاثرات
سود کا مکمل خاتمہ
بلا سودی بینکاری
نیا بجٹ اور سودی اسکیمیں

زمزم بکڈپو دیوبند